ڈاکٹر عبادت بریلوی
پروفیسر زبان و ادبیات اُردو، پنجاب یونیورسٹی
پرنسپل
یونیورسٹی اورینٹل کالج۔ لاہور

شعبۂ تاریخ ادبیات
ادارۂ ادب و تنقید، لاہور

سلسلۂ مطبوعات شعبۂ تاریخ ادبیات ، ادارۂ ادب و تنقید ، لاہور

میر تقی میر

★

ڈاکٹر عبادت بریلوی
پروفیسر زبان و ادبیات اردو ، پنجاب یونیورسٹی
پرنسپل
یونیورسٹی اورینٹل کالج ، لاہور

★

شعبۂ تاریخ ادبیات
ادارۂ ادب و تنقید ، لاہور

تصنیف : میر تقی میر
مصنف : ڈاکٹر عبادت بریلوی
طابع : سید اظہارالحسن رضوی
مطبع : مطبع عالیہ ، ۱۲۰ میکلوڈ روڈ ، لاہور
سرورق : سید انور حسین شاہ نفیس الحسینی
ناشر : شعبۂ تاریخ ادبیات ، ادارۂ ادب و تنقید ، لاہور
تعداد : گیارہ سو

عزیز دوست اور عظیم انسان

پروفیسر ڈاکٹر ممتاز علی قاضی

کے نام

جو وزارت تعلیمات حکومت پاکستان کے سربراہ ہونے کے باوجود ابھی تک ایک پروفیسر کا مزاج رکھتے ہیں ، اور اس پر فخر کرتے ہیں—اور اسی میں اُن کی بڑائی ہے -

ڈاکٹر عبادت بریلوی

فہرست

پیش لفظ

آردو شاعری میں میر تقی میر کی شخصیت اتنی دل کش اور ان کی شاعری کچھ اس درجہ دلآویز ہے کہ ان کے ساتھ ہر حال میں ایک رابطہ رکھنے کو جی چاہتا ہے۔

میں نے اپنی طالب علمی کے زمانے سے یہ رابطہ رکھا، اور گذشتہ چالیس سال کچھ اس طرح گزرے کہ میں ہمیشہ کسی نہ کسی طرح میر سے قریب رہا۔ ان کے کلیات کو ہمیشہ اپنے سرہانے رکھا، روزانہ اس کا مطالعہ کیا اور کسی نہ کسی تقریب سے ان کی شخصیت اور شاعری کے بارے میں باتیں کیں، مضامین لکھے، جلسے ترتیب دے؛ اور تقریباً تیس سال تک میں اپنے طالب علموں کو میر پڑھاتا بھی رہا — اس تمام عرصے میں ایک لمحہ بھی ایسا نہیں آیا جب میر کی شخصیت اور شاعری نے مجھ پر ایک سرخوشی کی کیفیت نہ طاری کی ہو۔

آج بھی، کہ میں زندگی کے بےشمار نشیب و فراز دیکھ چکا ہوں، اور عمر عزیز کی اس منزل پر پہنچ جانے کے باوجود جب جذبات سرد ہونے

لگتے ہیں ، میں میر کی شخصیت اور شاعری سے متاثر ہونے کی صلاحیت رکھتا ہوں ۔ اس حقیقت کا شعور رکھتے ہوئے بھی کہ میر بنیادی طور احساس اور جذبے کی شدت کا شاعر ہے ، میرے حواس پر اس کی شخصیت اور شاعری سرخوشی بن کر چھاتی ہے ، اور میں اس میں گم ہو جاتا ہوں ، ڈوب جاتا ہوں ، کھو جاتا ہوں ۔

میر سے اس دل چسپی ہی نے ، عرصہ ہوا ، میرے دل میں ان کے کلام کو مرتب کرنے کا چراغ روشن کیا اور نامکمل صورت ہی میں سہی ، وہ شائع بھی ہوا ۔ پریس والوں کی لاپروائی کی وجہ سے اس میں غلطیاں بھی رہ گئیں ۔ لیکن اس کے باوجود آج ہونے دو ہزار صفحات کی یہ کتاب اس طرح نایاب اور ناپید ہوئی کہ اب اس کا کوئی نسخہ کسی قیمت پر نہیں ملتا ۔

کلیاتِ میر کے اس نسخے پر میں نے ایک مفصل مقدمہ بھی لکھا تھا جس کی حیثیت ایک مستقل کتاب کی تھی ۔ اس مقدمے کو شوق سے پڑھا گیا ۔ ادیبوں اور نقادوں ، استادوں اور طالب علموں نے اس کو سراہا ۔ مختلف یونیورسٹیوں نے اس کو اپنے نصابوں میں بھی شامل کیا ۔ مضامین و مقالات میں اس کے حوالے بھی دیے گئے ۔ بعض غیر ملکی زبانوں میں اردو کے پروفیسروں نے اپنے طالب علموں کے لیے اس کے کئی حصوں کے ترجمے بھی کیے ۔ غرض اس کو پسند کیا گیا ۔ حالانکہ یہ رواروی میں لکھا گیا تھا ۔

ادھر کئی سال سے کلیات میر کے ساتھ یہ مقدمہ بھی نایاب ہوگیا ۔ چنانچہ احباب اور طالب علم اصرار کرنے لگے کہ اس کو کتابی صورت میں شائع کیا جائے ۔ اس اصرار سے مجبور ہو کر میں نے اس پر نظر ثانی کی ، اور اس میں ترمیم و اضافہ بھی کیا ۔ میر کے تنقیدی شعور اور میر کی ادبی اہمیت پر دو نئے باب بھی اس میں شامل کئے ، اور اب یہ آپ کے سامنے کتابی صورت میں موجود ہے ۔

میر کے مطالعے کے نتائج تو میری آئندہ شائع ہونے والی چار کتابوں (۱) حیات میر (۲) میر کی غزل (۳) منظومات میر اور (۴) میر کی شاعری

کا جمالیاتی پہلو ، میں سامنے آئیں گے ۔ ان کتابوں میں میر کی شخصیت اور شاعری کے مختلف پہلوؤں کی دل چسپ تفصیل و جزئیات ہوگی جس کو تحقیقی اور تنقیدی زاویہٴ نظر سے تجزیاتی انداز میں پیش کیا جائے گا ۔

یہ کتاب ، جو اس وقت ''میر تقی میر'' کے نام سے شائع کی جا رہی ہے ، اس کو ان چاروں کتابوں کی تمہید ، مقدمہ یا خاکہ کہا جا سکتا ہے ۔ لیکن اس میں بھی میں نے میر کی شخصیت اور شاعری پر زیادہ سے زیادہ مواد جمع کرنے کی کوشش کی ہے ، اور اختصار کے ساتھ ہی سہی ، ان کے مختلف پہلوؤں کا تنقیدی تجزیہ بھی کیا ہے ۔

اورینٹل کالج لاہور　　　　　　　　　　عبادت بریلوی

۱۶ جنوری ۱۹۸۰ء

۱

میر تقی میر

میر تقی میر اردو کے نامور شاعر ہیں ۔ ان کی ناموری کا راز اس میں ہے کہ انھوں نے شاعری کو درد اور درد کو شاعری بنا دیا ہے ۔ دوسرے شاعروں کے یہاں شاعری میں درد تو ہو سکتا ہے یا درد بھری شاعری تو ہو سکتی ہے لیکن خود درد کو شاعری بنا دینا سوائے میر کے کسی اور کے بس کی بات نہیں ۔ اُن کے یہاں ان دونوں کی مکمل ہم آہنگی ملتی ہے ، اور اسی میں ان کا کمال ہے ۔ انھوں نے زندگی بھر شعر کے پردے میں غم سنایا ہے کیونکہ اُن کی زندگی اسی غم سے عبارت تھی ۔ اسی لیے ان کے دل کا مرثیہ نہ صرف انھیں رلاتا ہے بلکہ دوسرے بھی اس پر آنسو بہاتے ہیں ۔ انھوں نے مصرعے موزوں نہیں کیے ، دل جگر کو خون کیا ہے ۔ اسی لیے تو ان کے دیوان میں قیامت کا سا ہنگامہ ہے اور جہاں سے دیکھیے ایک شعر شور انگیز نکلتا ہے ۔ وہ بہت بڑے شاعر ہیں لیکن اپنے آپ کو خود شاعر نہیں کہتے ۔ اُن کا دعویٰ تو صرف یہ ہے کہ انھوں نے درد و غم کو جمع کرکے دیوان

بنا دیا ہے ۔ اس عجز و انکسار کا یہی مطلب ہے کہ ان کی شاعری درد و غم ہی سے عبارت ہے ۔ اُن کے دیوان کے ہر شعر کی بنیاد یہی درد و غم ہے ۔ اُن کا ہر خیال اسی کے گرد گھومتا ہے ۔ بظاہر ان کے کلام میں جہاں شگفتگی اور مسرت کی جھلک نظر آتی ہے وہاں بھی کسی نہ کسی گوشے میں درد و غم کا بسیرا ہوتا ہے ۔ کسی جگہ اگر وہ سرور و انبساط اور مسرت و شادمانی کی باتیں بھی کرتے ہیں تو ان کی تہ میں رنج و الم جھانکتے نظر آتے ہیں ۔ غرض میر سرتاپا درد و غم اور رنج و الم ہیں اور اُن کی شاعری بھی شروع سے آخر تک اسی درد و غم اور رنج و الم کی تصویر ہے ۔

یہ صورت حال میر کے یہاں ہرگز پیدا نہ ہوتی اگر انہوں نے شعر کو سخن کا پردہ نہ کیا ہوتا ۔ اُن کے یہاں یہ صورت تو اسی لیے پیدا ہوتی ہے کہ انہوں نے شعر کے پردے میں بات کہنی چاہی ہے اور اپنی بات کہنی چاہی ہے ۔ ان کی بات میں حسرت ہے ، ناکامی ہے ، اداسی ہے ، غمگینی ہے کہ اسی سے اُن کی زندگی عبارت تھی ۔ اس کا اظہار ان سے براہ راست نہیں ہو سکا ہے ۔ اس لیے اُنہوں نے شعر کہے ہیں ۔ گویا شعر کو اظہار کا ذریعہ بنایا ہے ، شعر کہنے کی خاطر شعر نہیں کہے ہیں ۔ دل پر جو بوجھ تھا ، شعر کہ کر اُس کو ہلکا کرنے کی کوشش کی ہے ۔ اس سے اُن کا غم غلط ہوا ہے ۔ کیونکہ اس طرح انہوں نے اپنے ہم نوا پیدا کیے ہیں ۔ اپنے غم میں دوسروں کو شریک کیا ہے ۔ ہمدم و دمساز ، ہمکار و ہمنوا بنائے ہیں ۔ اس طرح ان کی اس غیر شعوری لیکن فطری کیفیت نے ان کے فن کی تخلیق کی ہے اور لوگوں نے اس کو اُن کا فن سمجھ بھی لیا ہے ۔ میر کے یہاں جس بے پناہ خلوص اور بے انداز صداقت کا احساس ہوتا ہے ، اس کا سبب یہی صورت حال ہے ۔ ان کا ہر شعر جو اس درجہ ڈوبی ہوئی کیفیت کا حامل ہوتا ہے ، اس کی وجہ بھی یہی ہے ۔ ان کے کلام میں وہ جو ایک سادگی ، برجستگی اور بے ساختگی ہے وہ بھی اسی صورت حال کی پیداوار ہے ۔ میر نے شعر کا فن شعوری طور پر اختیار نہیں کیا ۔ اُن کے یہاں شعر اس طرح پیدا ہوتا ہے جیسے کوئی سیال چیز لبریز ہو جانے کے باعث اپنے ظرف سے چھلک

پڑتی ہے ، اور چھلک کر باہر نکل آتی ہے ، اور اس میں شک نہیں کہ ان کے سارے کلام میں اس چھلکی ہوئی کیفیت کا پتہ چلتا ہے - میر کی زندگی حسرت کا مجسمہ اور مایوسی کا مرقع تھی - اسی حسرت اور مایوسی نے چھلک کر آن کی شاعری کی صورت اختیار کر لی ہے - اسی لیے وہ خود بھی حسرت کا مجسمہ اور مایوسی کا مرقع معلوم ہوتی ہے - آن کے سارے کلام میں سوز و گداز اور نشتریت کی جو ایک لہر سی دوڑی ہوئی نظر آتی ہے ، وہ بھی اسی صورت حال کی پیداوار ہے -

میر کی یہ شاعری ، جو درد و غم اور رنج والم کی ترجمانی اور عکاسی کے باعث سوز و گداز اور نشتریت سے بھرپور ہے ، اداس ضرور کرتی ہے لیکن اس میں گھٹن کا احساس نہیں ہوتا - یہی وجہ ہے کہ اس میں دلچسپی لی جا سکتی ہے - اس سے غم غلط کیا جا سکتا ہے - وہ زخمی دلوں کے لیے نشتر نہیں بلکہ مرہم ہے - میر کی شاعری میں اس خصوصیت نے اندھیری رات کی سی کیفیت پیدا نہیں کی ہے ، بلکہ اس فضا کو پیدا کیا ہے جو سلگتی ہوئی شام کے دھندلکے میں ہوتی ہے - شام کے دھندلکے میں تاریکی کے بڑھتے ہوئے سایے گھبراہٹ کا باعث ضرور بنتے ہیں - اس فضا میں دل ڈوبنے ضرور لگتا ہے لیکن اس میں ایک سکون بخش کیفیت بھی ہوتی ہے - کیونکہ یہ سائے شفق کی رنگینی کے ساتھ مل کر دلچسپی کا سامان ضرور پیدا کر دیتے ہیں جس سے انسان گھبراتا نہیں ، بیزار نہیں ہوتا ، بلکہ اس فضا میں ڈوب جاتا ہے ، کھو جاتا ہے اور اسے اپنی خبر ذرا کم ہی رہتی ہے - کچھ ایسا ہی حال میر کی شاعری کا بھی ہے -

اگر ایسا نہ ہوتا تو میر کی شاعری میں عمومیت اور آفاقیت نہ ہوتی - اس سے ہر ایک دلچسپی نہ لے سکتا - صرف افسردہ دل ہی اس کے گرویدہ ہوتے اور وہ ان کے لیے بھی مزید افسردگی کا باعث بنتی - لیکن میر کی شاعری میں صورت حال اس سے مختلف ہے - وہ حد درجہ داخلی ، شخصی اور انفرادی ہونے کے باوجود اپنے اندر وسعتیں رکھتی ہے - کیونکہ اس میں میر سے زیادہ وہ انسان نظر آتا ہے جو میر ہو سکتا ہے ، جس پر وہ

سب کچھ بیت سکتی ہے جو میر پر بیتی ہے ، جس کی دنیا میں وہ تمام حالات پیدا ہو سکتے ہیں جو میر کی دنیا میں پیدا ہوئے ہیں ۔ اسی لیے میر کی شاعری ، اس کا غم ، اس کی نشتریت ، اس کا گداز ، بیزاری کے بجائے ان کی شاعری میں ایک ایسی موانست کو پیدا کرتے ہیں جو انسانی فضا ہی کے ہاتھوں وجود میں آ سکتی ہے ۔ میر کی شاعری میں انسان ہے ، انسانیت کی آواز ہے اور اسی لیے اس میں آفاقیت ہے جو کسی حال میں بھی اس کے سحر کو ختم نہیں ہونے دیتی ۔ ہر زمانے میں اس کا اثر ہو سکتا ہے ۔ ہر فرد کو وہ متاثر کر سکتی ہے ۔ اس کے لیے زمان و مکان کی قید نہیں ۔ وہ ان سب سے آزاد ہے ۔ اسی لیے اس کا اثر عالمگیر اور آفاقی ہے ۔ بظاہر وہ محدود ہے ۔ لیکن درحقیقت اس میں خود حیات و کائنات ہی کی سی وسعتیں ہیں ۔ اس کی کوئی تھاہ نہیں ۔ وہ تو ایک اتھاہ سمندر ہے ۔

میر کی شاعری میں اعلیٰ معیار ہیں ۔ زندگی کی ارفع قدریں ہیں ۔ صداقت اس کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑتی ۔ پاکیزگی اس کا دامن پکڑ کر چلتی ہے ۔ اس لیے اس سے بہت کچھ حاصل بھی ہوتا ہے ۔ وہ اپنی طرف سے بہت کچھ دیتی بھی ہے ۔ اس کا کام صرف ذہنی سکون پہنچانا ہی نہیں ہے ۔ وہ محض جذبات کی تہذیب ہی نہیں کرتی ، بنیادی انسانی قدروں کا احساس بھی دلاتی ہے ۔ اس نے یہ بھی سکھایا ہے کہ انسان کو کیا کرنا چاہیے اور وہ کیا کچھ کر سکتا ہے ، خصوصاً ان حالات میں جب وہ کسی آزمائش سے دوچار ہو ۔ بلکہ میر کی شاعری تو یہ سکھاتی ہے کہ آزمائش کے موقع پر انسان کو زیادہ سخت یا سخت جان ہو جانا چاہیے کہ یہی اس کی زندگی کا حاصل ہے ۔ اسی سے وہ پہچانا جاتا ہے ۔

اور انھی تمام حالات کا یہ نتیجہ ہے کہ میر کے زمانے میں ، ان کے بعد برسوں تک ، بلکہ آج بھی کہ دنیا بہت بدل گئی ہے ، ان کی شاعری اپنے اندر وہ سحر رکھتی ہے جس کی وجہ سے اس کا تذکرہ گھر گھر نظر آتا ہے ، شہروں شہروں ، ملکوں ملکوں اس کی دھوم ہے ۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ میر کی مقبولیت اور ان

کی شاعری کا قبول عام ، جو اُن کے زمانے میں تھا ، وہی آج بھی ہے - بلکہ اب تو اس میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے -

اور ایمان کی بات یہ ہے کہ اردو میں آج میر کو جو مقبولیت حاصل ہو رہی ہے - اتنی مقبولیت شاید سوائے غالب اور اقبالؒ کے کسی دوسرے شاعر کو حاصل نہیں -

---

۲

میر کے حالات

میر کی زندگی کے حالات کا مد و جزر اور ان کی شخصیت کا نشیب و فراز اُن کی شاعری کو سمجھنے میں بہت مدد دیتا ہے ، کہ وہ درحقیقت اسی کا ایک عکس ہے ۔ میر پر جو کچھ بیتی، جن حالات میں سے ہو کر انہیں گزرنا پڑا ، جو سانحات انہیں پیش آئے ، جن شخصیتوں کے زیر سایہ ان کی نشو و نما ہوئی اور جن معاملات و مسائل سے انہیں دو چار ہونا پڑا ، ان سب کا اثر ان کی شاعری میں موجود ہے ۔ اُن کی شاعری ان سب کا ایک ایسا آئینہ ہے جس میں اُن حالات اور معاملات و مسائل کی تفصیل و جزئیات تک کو دیکھا جا سکتا ہے ۔ میر کی شاعری حد درجہ داخلی ہے ۔ واردات و کیفیات اس کے محرکات ہیں ۔ اس لیے ان کی تشکیل و تعمیر میں ان کے نجی حالات کو بڑا دخل ہے ۔ یوں تو ہر داخلی شاعر کے یہاں ، جو واردات و کیفیات پر اپنی شاعری کی بنیاد رکھتا ہے ، اس کے شخصی اور نجی حالات کے اثرات ہوتے ہیں ۔ لیکن میر کے یہاں ان اثرات کی فراوانی کا احساس کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے ۔ کیونکہ

میر ضرورت سے کچھ زیادہ ہی حساس اور جذباتی تھے۔ ہر واقعے اور سانحے کا اثر آن پر کچھ زیادہ ہی ہوتا تھا ۔ اس لیے زندگی کی بعض بالکل معولی اور چھوٹی چھوٹی باتیں زندگی کے ہر دور میں ان کے لیے اچھے خاصے مسائل بن گئی ہیں ۔ ظاہر ہے اس کا اثر شاعر کے ذہن پر ہونا چاہیے ۔ میر کے ذہن پر یہ اثرات بہت نمایاں ہیں اور اسی لیے اس کا اثر ان کی شاعری میں بھی نظر آتا ہے ۔

''ذکر میر'' کے مطالعے سے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہوتی ہے ۔ یہ کتاب میر کی محض خود نوشت سوانح حیات ہی نہیں ، یہ تو ایک ایسا مرقع ہے جس میں میر نے اپنی زندگی کے واقعات کو سامنے رکھ کر اپنی ذہنی اور جذباتی کیفیت کی زندہ اور چلتی پھرتی تصویریں پیش کی ہیں ۔ مختلف زمانوں میں جو کچھ انھوں نے دیکھا ہے ، جو محسوس کیا ہے، جو کچھ سوچا ہے ، جو خیالات قائم کیے ہیں، جن نظریات کی تشکیل کی ہے ، ان سب کی تفصیل اس کتاب میں ملتی ہے اور اس اعتبار سے اس کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے ۔ میر کے مطالعے میں اس سے بڑی مدد ملتی ہے کیونکہ اس سے میر کی زندگی کے متعلق بعض اہم حقیقتوں کا انکشاف ہوتا ہے اور ان کی پہلو دار اور تہہ در تہہ شخصیت کے اسرار و رموز بے نقاب ہوکر سامنے آتے ہیں ۔

(۲)

میر ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے تھے ۔ لیکن ہمیشہ ان کے خاندان کے لوگوں کو نا مساعد حالات سے سابقہ رہا ۔ ان کے بزرگوں نے اپنے وطن حجاز کو خیر باد ہی اس لیے کہا کہ حالات ان کے لیے وہاں سازگار نہیں تھے ۔ میر نے یہ لکھا ہے کہ آن کے آبا و اجداد نے حجاز مقدس سے رخصت ہوکر ہندوستان کا رخ کیا اور دکن کی سرزمین میں ہوتے ہوئے احمدآباد گجرات پہنچے ۔ وہاں سے میر کے جد کلاں اکبرآباد آئے اور وہاں آ کر بس گئے ۔ اکبر آباد کو اس زمانے میں مرکزیت حاصل تھی ۔ وہ مغلوں کا دارالخلافہ تھا ۔ اس لیے یہاں انھیں زیادہ آسانیاں فراہم ہوئیں ۔ ان کے جد کلاں کو اکبر آباد کی آب و ہوا راس

نہ آئی ۔ اس لیے ان کی صحت خراب ہوگئی اور وہ جلد ہی انتقال کرگئے ۔ ان کی اولاد میں ایک فرزند تھے ۔ جنھیں میر اپنا دادا بتاتے ہیں ۔ میر کے دادا ، اپنے والد کے انتقال کے بعد سخت پریشان رہے ۔ تلاش معاش میں لگے رہے ۔ خاصی دوڑ دھوپ کے بعد انھیں اکبر آباد کی فوج داری کا عہدہ ملا ۔ اس کے بعد ان کی زندگی کسی قدر ، آرام اور اطمینان سے گزری لیکن موت نے انھیں بھی چین نہ لینے دیا ۔ پچاس سال کی عمر میں وہ بہ سلسلہ ملازمت گوالیار گئے اور وہیں انھوں نے اس دنیا سے کوچ کیا ۔ میر کے دادا نے دو بیٹے چھوڑے ۔ بڑے بیٹے کا دماغ ٹھیک نہیں تھا ۔ وہ نوجوانی ہی میں مر گئے ۔ چھوٹے بیٹے میر کے والد تھے ۔ انھیں شروع ہی سے درویشی کے ساتھ لگاؤ تھا ۔ چنانچہ انھوں نے جوانی ہی میں دنیا کو ترک کر دیا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گوشہ نشین ہوگئے ۔

یہ تو معلوم نہ ہو سکا کہ میر کے جدِ کلاں اور جد کا کیا نام تھا ۔ کیونکہ اس سے تو شاید خود میر بھی ناواقف تھے ۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ ذکر میر میں اس کی صراحت ضرور کرتے لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا ہے ۔ البتہ اپنے والد کا نام لکھا ہے ۔ ان کے والد علی متقی کے خطاب سے مشہور تھے ۔ ''ذکر میر'' میں میر نے ہر جگہ اپنے والد کو اسی نام سے یاد کیا ہے ۔ صرف ایک جگہ اس کی وضاحت ہوئی ہے کہ ان کا نام محمد علی تھا ۔ وہ بھی اپنی زبانی نہیں بلکہ خواجہ باسط کی زبانی ۔ خواجہ باسط جب میر کو صمصام الدولہ کے حضور میں لے گئے تو انھوں نے پوچھا کہ یہ کس کا بیٹا ہے ؟ اس پر انھوں نے جواب دیا کہ میر محمد علی کا[1] ۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا نام محمد علی ہو سکتا ہے لیکن میر محمد علی کے نام سے انھیں کم لوگ جانتے تھے ۔ علی متقی ان کا نام مشہور تھا ۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے اسی خیال سے میر کے والد کا نام علی متقی تسلیم کر لیا ہے[2] اور یہی صحیح ہے ۔ ذکر میر میں ہر جگہ میر ان کا یہی نام لکھتے ہیں ۔ بعض تذکرہ

---

۱ ۔ ذکر میر ، ص ٦٢

۲ ۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق ، مقدمہ ذکر میر ، ص ۳

نگاروں ، خصوصاً سعادت خاں ناصر ، حکیم عبدالحئی اور محمد حسین آزاد نے ان کا نام میر عبداللہ بھی لکھ دیا ہے لیکن یہ نام صحیح نہیں معلوم ہوتا ۔ کیونکہ ذکر میر میں کہیں بھی اس نام کا ذکر نہیں ۔

میر علی متقی صحیح معنوں میں متقی اور پرہیزگار شخص تھے ۔ ان کی شخصیت نے میر پر گہرے اثرات چھوڑے ہیں ۔ درویشی میر علی متقی کی گھٹی میں پڑی تھی ۔ میر کے الفاظ میں وہ ''صوفی صاف اور درویش دل ریش'' تھے ۔ ابتدا ہی سے ان کی زندگی درویشانہ تھی ۔ انھوں نے بڑی عبادت اور ریاضت کے بعد اس میں ایک بلند مرتبہ حاصل کیا ۔ شاہ کلیم‌اللہ اکبرآبادی سے ، جو وہاں کے ''کامل اولیا'' میں سے تھے ، فیض حاصل کیا ۔ ان کی درویشی اِنھی بزرگ کی مرہونِ منت تھی ۔ اِنھی کے ساتھ انھوں نے ریاضت اور عبادت کی اور اس کا نتیجہ درویشی کی تکمیل کی صورت میں نکلا ۔ اسی اثر سے وہ جوان صالح اور عاشق پیشہ بنے اور ان کے دل میں گرمی پیدا ہوئی ۔ روز و شب یاد الٰہی میں مصروف رہنا میر علی متقی کا محبوب مشغلہ تھا ۔ وہ ہر وقت اپنے حال میں مست رہتے تھے ۔ دنیوی اور مادی زندگی سے انھیں کوئی سروکار نہیں تھا ۔ میر کو وہ بہت عزیز رکھتے تھے ۔ ان کی تربیت کی طرف سے انھوں نے کبھی غفلت نہیں برتی ۔ وہ ان کو ہمیشہ نصیحت کرتے رہتے تھے جس کا ماحصل یہ تھا کہ یہ زندگی بے کار اور لایعنی ہے ۔ زمانہ انسان کو کچھ کرنے کی بہت کم مہلت دیتا ہے ۔ اس لیے اس سے غافل نہیں رہنا چاہیے ۔ وہ ہمیشہ میر کو دیکھ کر کہتے کہ تیرے دل کے اندر کیا سوز ہے جو پوشیدہ ہے اور کون سی آگ ہے جو دبی ہوئی ہے ۔ میر اس پر ہنستے لیکن خود میر علی متقی زار و قطار روتے تھے ۔ میر کے لیے ان کی یہ نصیحت سب سے زیادہ اہم تھی کہ انسان کو عشق اختیار کرنا چاہیے کیونکہ بغیر عشق کے زندگی وبال ہے ۔ عشق ہی اس زندگی میں سب کچھ ہے ۔ ساری کائنات میں نظم و ضبط اسی عشق کی وجہ سے ہے ۔ اس لیے عشق زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہے ۔ اسی کو حاصل کر کے انسان اپنے آپ کو پاتا ہے ۔ اس لیے ایسا کرنے میں تاخیر نہیں کرنی چاہیے ۔ یہ دنیا فانی ہے ۔ انسان کا جسم ناپائدار ہے ۔ موت

زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہے - یہاں ہر چیز فنا کی طرف جا رہی ہے - کوئی چیز بھی یہاں باقی رہنے والی نہیں - چنانچہ اس دنیا سے دل لگانا اور اس کے ساتھ اپنے آپ کو ملوث کرنا نادانی ہے - اس لیے جہاں تک ممکن ہو علائق دنیوی سے اپنے آپ کو وابستہ نہیں کرنا چاہیے - انسان کا خیال ، اس کے ساتھ ہمدردی کا اظہار اور اخلاق کا برتاؤ ضروری ہے - توکل اور قناعت زندگی کی اعلیٰ قدریں ہیں - ان سے زندگی آسان ہو جاتی ہے - تکلف اور تصنع انسان کے لیے لایعنی چیزیں ہیں - انسان کو اس دنیا میں مسافروں کی طرح زندگی بسر کرنی چاہیے ، کہ ہر شخص یہاں رختِ سفر باندھنے میں مصروف ہے - اس سفر کی تیاری بہرحال ضروری ہے - میر لکھتے ہیں کہ ایک دن میں کھیل کود میں مگن تھا - یہ دیکھ کر میرے والد نے مجھے بلایا اور کہا کہ ''بیٹا ! یہ زمانہ بڑا ہی تیز رفتار ہے - یہ کسی کو کھیلنے اور تفریح کرنے کی فرصت نہیں دیتا - اس لیے اپنی تعلیم و تربیت کی طرف توجہ کرو - اس سے غفلت نہیں برتنی چاہیئے -''

میر علی متقی صاحبِ کرامات تھے - لوگوں کو اپنا گرویدہ کر لیتے تھے - رات رات بھر عبادت میں مصروف رہتے اور اسی عالم میں کبھی کبھی باہر نکل جاتے تھے - ایک دفعہ اکبرآباد سے دہلی گئے - پھر ایک دفعہ دہلی سے لاہور پہنچ گئے -

غرض یہ کہ کچھ اس قسم کے خیالات رکھنے والے بزرگ میر کے والد میر علی متقی تھے جن کے زیر سایہ میر کی ابتدائی نشو و نما ہوئی - ان کے کردار اور افکار و خیالات کے نقوش میر کی شخصیت پر اتنے گہرے ہوئے کہ زندگی بھر ان کا اثر میر پر رہا ہے -

(۳)

میر علی متقی کے یہ فرزند میر تقی اکبرآباد ہی میں پیدا ہوئے - انہوں نے اس سلسلے میں ''ذکر میر'' میں کچھ بھی نہیں لکھا ہے کہ کب پیدا ہوئے اور کہاں پیدا ہوئے - ان کی پیدائش کی صحیح تاریخ

---

۱ - ڈاکٹر مولوی عبدالحق : مقدمہ ذکر میر

کسی اور نے بھی نہیں لکھی ۔ وفات کی تاریخ پر سب متفق ہیں کہ ۱۲۲۵ھ مطابق ۱۸۱۰ء میں وفات پائی ۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے ان کی تاریخ وفات اور ''ذکر میر'' کی تاریخ کو سامنے رکھ کر جس وقت ان کی عمر ساٹھ برس تھی ، یہ نتیجہ نکالا تھا کہ وہ ۱۱۳۷ھ مطابق ۱۷۲۴ء میں پیدا ہوئے ہوں گے ۔ لیکن ریاست محمود آباد کے کتب خانے میں میر کے چوتھے دیوان کا جو ایک قلمی نسخہ ہے ، اس پر ان کے شاگرد محمد محسن کے ہاتھ کی جو عبارت درج ہے ، اس سے یہ نتیجہ نکالنا پڑتا ہے کہ وہ ۱۱۳۵ھ مطابق ۱۷۲۲ء میں پیدا ہوئے ۔ یہ عبارت مولانا آسی کے حوالے سے یہاں درج کی جاتی ہے :

''بروز جمعہ بستم شعبان المکرم وقت شام ۱۲۲۵ھ دوازدہ صد و بست و پنج ہجری بود کہ میر محمد تقی صاحب میر تخلص صاحب این چہارم دیوان در شہر لکھنئو در محلہ سٹھٹی بعد طے نہ عشرۂ عمر بجوارِ رحمت ایزدی پیوستند و بروز شنبہ بست و یکم ماہ مذکور سنہ الیہ وقت دوپہر در اکھاڑہ بھیم کہ قبرستان مشہور است ، نزد قبور اقربائے خویش مدفون شدند و چہار دیوان خود را کہ این دیوان چہارم ہم ازان جملہ است ، بہ محرر سطور محمد محسن المخاطب بہ زین‌الدین احمد تجاوز اللہ عن سیاتہ در حینِ حیات خویش بہ کمال رغبت بحلِ کردہ بخشیدند ۔ خدائیش بیا مرزاد ۔''

اس عبارت کے نیچے دو قطعے درج ہیں جن سے یہی تاریخ وفات نکلتی ہے ۔ وہ قطعے یہ ہیں :

محمد تقی میر شاعر کہ بود
مسلّم و را تخت و تاجِ سخن

بہ اقلیم معنی ز اربابِ شعر
ستانندہ او بود باجِ سخن

ز مرگش چو بے نور شد شعر سال
نوشتم بہ مردہ سراج سخن
۱۲۲۵ھ

میر تقی استاد فن شعر
مرد و ز دنیا سوئے عدم شد

گشت چو اشعارش ھمہ بے سر
میر تقی استاد رقم شد

۱۲۲۶ – ۱ = ۱۲۲۵ھ

اس کو نقل کرنے کے بعد مولانا آسی لکھتے ہیں :

"بارہ سو چھبیس میں پہلے مصرع کے اشارے "گشت چو اشعارش ھمہ بے سر" - ۱۲۲۶ھ کے مطابق اشعار کا الف نکالنے سے ۱۲۲۵ھ رہ جاتے ہیں - اس نسخے کے ایک صفحے پر نوادر الکملا کی عبارت بھی درج ہے جو آگے چل کر حسب ضرورت نقل کی جائے گی - مگر فی الحال سنِ ولادت کے تعین کے جھگڑے کو صاف کر دینا ہے کہ اس عبارت کے دیکھنے کے بعد ہم کو کوئی شبہ باقی نہیں رہتا کہ میر صاحب نے ۹۰ برس کی عمر پائی اور ۱۲۲۵ھ میں سے جب ۹۰ منہا کر دیجیے تو ۱۱۳۵ جو باقی رہے اور یہی سن ولادت ہے اور اسی کی ایک دوسری عبارت سے بھی تائید ہوتی ہے جو اس کتاب کے ایک دوسرے صفحے پر نوادرالکملا سے نقل کی گئی ہے کہ "در اواخر یک ہزار و یک صد و سی و پنج ہجری ولادت واقع شدہ[۱] -"

بہرحال اب میر کی ولادت کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے - یہی تاریخ یعنی ۱۱۳۵ھ صحیح ہے -

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے - میر کی ابتدائی تعلیم و تربیت اپنے والد ہی کے زیر سایہ ہوئی لیکن وہ بزرگ اپنے آپے میں کہاں تھے - اس لیے سات سال کی عمر میں انھوں نے میر کو اپنے عزیز شاگرد سید امان اللہ کے سپرد کیا - سید امان اللہ کو میر کے والد بہت عزیز رکھتے اور انھیں برادر عزیز کہتے تھے - اس نسبت سے میر نے انھیں

---

۱ - عبدالباری آسی : مقدمہ کلیات میر ، ص ۸ ، ۹ (نول کشور)

"عم بزرگوار" کے نام سے یاد کیا ہے ۔ شب و روز وہ اپنے انھی عم بزرگوار کے ساتھ رہتے تھے ۔ انھی سے انھوں نے ابتدا میں قرآن مجید پڑھا اور دینی تعلیم بھی حاصل کی ۔ میر کے یہ عم بزرگوار سید امان اللہ ان کے والد تک کس طرح اپنی نئی نویلی دلہن کو چھوڑ کر پہنچے اور انھی کے ہو رہے ، یہ ایک لمبی کہانی ہے ۔ ہمیں اس سے بحث بھی نہیں ۔ ہمیں تو یہ دیکھنا ہے کہ ان کے والد کے اس مقرب خاص نے اس کی کایا پلٹی اور اس نے میر کو سب کچھ دیا ، یعنی ان کی تعلیم و تربیت کا سہرا انھی کے سر ہے ۔ میر نے خود لکھا ہے کہ ان کے ساتھ رہنے سے انھیں بے شمار فائدے ہوئے ۔ روحانیت سے لگاؤ ، رندی سے نسبت ، درویشی سے رغبت ، قلندری سے انس ، یہ سب ان کے چچا سید امان اللہ ہی کا عطیہ ہے ۔ میر کو بھی اپنے والد میر علی متقی اور اپنے چچا میر امان اللہ سے گہرا لگاؤ تھا ۔ اس لیے جب ان کا انتقال ہوا ہے تو ان کی پریشانی کی کوئی حد نہیں تھی ۔

ان دونوں کی وفات نے میر کے سامنے قیامت کا منظر پیش کر دیا اور اس کے بعد وہ خاصے عرصے تک پریشان رہے ، میر امان اللہ کے انتقال نے انھیں ایک شفیق استاد اور رہنما سے محروم کر دیا اور میر علی متقی کے انتقال نے انھیں صرف باپ کے سائے ہی سے محروم نہیں کیا بلکہ ان کی زندگی متزلزل ہوگئی ۔ آسمان ان پر ٹوٹ پڑا ، وہ بے یار و مددگار ہوگئے اور ادھر آدھر مارے مارے پھرنے لگے۔

میر کی عمر اس وقت کوئی دس سال کی تھی ۔

(۲)

والد کے انتقال کے بعد میر کے سوتیلے بھائیوں نے ان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا ۔ چھوٹی سی عمر میں بے شمار مصیبتیں ان پر آ پڑیں ۔ قرض خواہوں کا بوجھ انھیں اٹھانا پڑا ۔ گھر میں کھانے کو نہیں تھا ۔ اس لیے عسرت نے انھیں گھر سے باہر نکالا اور وہ معاش کی تلاش میں در در کی خاک چھاننے لگے اور چونکہ انھوں نے کبھی کسی کا احسان

---

۱ ۔ ذکر میر

نہیں اٹھایا تھا ، اور اپنی خودداری کو مجروح نہیں ہونے دیا تھا ۔ اس لیے یہ پریشانیاں کچھ اور بھی بڑھتی گئیں اور ان الجھنوں میں کچھ اور بھی اضافہ ہوتا گیا ۔

آگرے میں بہت ہاتھ پاؤں مارے لیکن زیست کی کوئی صورت نہ نکلی ۔ کئی سال اسی طرح گزر گئے تو ناچار تلاش معاش کے سلسلے میں دلی کا رخ کیا ۔ دلی اس زمانے میں خود پریشان حال تھی ۔ نفسا نفسی کا عالم تھا ۔ ہر شخص کو اپنی اپنی فکر تھی ۔ شاہوں کا جلال اور امرا کا اقبال برائے نام رہ گیا تھا ۔ ہر شخص کے لیے اپنی ہی زیست مشکل تھی تو دوسروں کی فکر کوئی کیا کرتا ۔ دلی میں بھی میر کے افلاس کا وہی عالم رہا ۔ مارے مارے پھرتے رہے لیکن کامیابی نہ ہوئی ۔ کوئی دوست نہ ملا ، کسی نے دست گیری نہیں کی ۔ میر نے اس کیفیت کی روداد بڑے ہی المیہ اور روح فرسا انداز میں بیان کی ہے ۔ لکھتے ہیں :

”بے مروتی ہائے آسمان را دیدم ، ستم ہائے روزگار کشیدم ، بے نے گناہ فلک و جرم زمانہ چیست ، من ستارہ نہ داشتم کہ سایۂ چنیں آفتابے از سر من رفت ۔ ہرچہ کرد طالع من کرد ۔ غیر از دست خود برسر نیافتم ، یعنی کسے را سایہ گستر نیافتم ۔ خانماں برسر غیرت نہادم ۔ زنہار بر در کس نہ ایستادم ۔ لبم بہ حرف طلب آشنا نہ گردید ۔ چشم من بہ ہیچ چیز نہ دوید ۔ سایۂ دست کسے نہ گرفتم و سر دستے بہ من کسے نہ گرفت یعنی خدائے کریم مرا شرمندۂ احسان کسے نہ کرد و دست نگر برادر کہ سر بسر من داشت نہ ساخت نقل ماتم درویش قسمت ساختم کار را بہ لطف خداوند انداختم ۔ در خود را بہ برادر خرد سپردہ بہ تلاش روزگار در اطراف شہر استخواں شکستم ، لیکن طرفے نہ بستم، یعنی چارۂ کار در وطن نہ یافتم، ناچار بہ غربت شتافتم ۔ رنج راہ خود ہموار کردم، شدائد سفر اختیار کردم ، بہ شاہجہان آباد دہلی رسیدم ، بسیار گردیدم ، شفیقے نہ دیدم[1] ۔“

---

۱ ۔ ذکر میر ، ص ۶۱ ، ۶۲

یعنی والد کے انتقال کے بعد میں نے آسمان کی بے مروتی دیکھی ، زمانے کے ستم اٹھائے ، لیکن اس میں آسمان اور زمانے کا کیا قصور ہے ۔ میری قسمت ہی ایسی تھی کہ اس آفتاب کا سایہ میرے سر سے اٹھ گیا ۔ جو کچھ کیا میرے نصیب نے کیا ۔ اس میں یہی سب کچھ لکھا تھا ۔ اب میرا کوئی سرپرست نہ تھا کوئی سر پر ہاتھ رکھنے والا نہ تھا۔ لیکن میری غیرت نے کسی کے احسان اٹھانے کو گوارا نہ کیا ۔ میرے اندر کسی چیز کی طمع کبھی نہیں پیدا ہوئی ۔ کسی سے میں نے امداد نہیں چاہی ۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے کسی کا شرمندۂ احسان نہ ہونے دیا اور بڑی بات یہ ہے کہ مجھے بڑے بھائی کا دست نگر نہ بنایا ۔ میں ہر وقت درویش یعنی اپنے والد کا ماتم کرتا تھا اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرکے چھوٹے بھائی کو گھر بٹھا کر تلاش روز میں نکلتا تھا ۔ میری ہڈی پسلی ایک ہوگئی ۔ لیکن کچھ نتیجہ نہ نکلا ۔ بالاخر میں نے وطن کو خیرباد کہہ کر باہر نکلنے کی ٹھانی ۔ سفر کیا ۔ دہلی پہنچا ۔ ادھر اُدھر مارا مارا پھرا لیکن کوئی شفیق دوست نظر نہ آیا ۔

اس تحریر کے ایک ایک لفظ سے پریشانی ٹپکتی ہے اور ”شفیقے نہ دیدم“ میں تو ایسی حسرت ہے جس کو بے بسی اور کس مپرسی ہی کا عالم پیدا کر سکتا ہے ۔ بہرحال میر اس ذہنی کیفیت کے ساتھ دلی میں پریشان پھرتے رہے ۔ اسی عالم میں اُن کی ملاقات خواجہ محمد باسط سے ہوئی ۔ خواجہ باسط صمصام الدولہ امیرالامرا کے بھتیجے تھے ۔ انھوں نے میر کے حال پر عنایت کی اور نواب کے پاس لے گئے ۔ نواب نے یہ معلوم کرکے کہ میر، میر علی متقی مرحوم کے صاحب زادے ہیں ، ان کے ساتھ محبت کا برتاؤ کیا ، شفقت سے پیش آئے اور ایک روپیہ روز اپنی سرکار سے مقرر کیا ۔ اس سے میر کو بڑا سہارا ملا اور دلی میں زیست ممکن ہوگئی ۔ لیکن کچھ ہی عرصے بعد دلی پر وہ قیامت ٹوٹی جسے نادر شاہ کا حملہ کہتے ہیں ۔ سارا نظام درہم برہم ہوگیا ۔ دلی اُجڑ گئی ۔ تیموری اُمرا خاک میں مل گئے ۔ ابتری اور انتشار کا وہ دور دورہ ہوا کہ اس سے قبل زمانے کی آنکھ نے نہیں دیکھا تھا ۔ صمصام الدولہ امیر الامرا اس ہنگامے میں مارے گئے اور میر کے لیے پھر کوئی ٹھکانا نہ

رہا ۔ روزینہ سے جو اطمینان کا سانس لینا نصیب ہوا تھا ، اُس کی عمر صرف ایک سال تھی ۔ اس کے بعد اُن کا پھر وہی حال ہوگیا جو اس سے پہلے تھا ، بلکہ اس سے بھی بدتر !

جب بہت پریشان ہوئے تو پھر آگرے واپس گئے لیکن وہاں بھی سوائے پریشانی اور زبوں حالی کے اور کچھ نہ تھا ۔ مجبوراً پھر دلی واپس آئے اور اب کے ہار کر اپنے سوتیلے ماموں سراج الدین علی خان آرزو کے یہاں قیام کیا ۔ اس قیام سے ان کی پریشانیوں میں کچھ اور بھی اضافہ ہوگیا ۔ ابھی تک تو تلاش معاش ہی کی الجھن تھی ۔ اب خان آرزو کی بد سلوکی بھی اس میں شامل ہوگئی جس نے انہیں ذہنی طور پر مفلوج کر دیا ۔ سوتیلے بھائی سے میر کے تعلقات اچھے نہیں تھے ۔ انہوں نے خان آرزو کو لکھ بھیجا تھا کہ ان کی دیکھ بھال بالکل نہ کی جائے کیونکہ وہ فتنۂ روزگار ہیں ۔ اس پر خان آرزو ان کے پیچھے پڑ گئے اور انہیں بہت آزار پہنچایا ۔ میر کے لیے یہ بات خاصی پریشانی کا باعث ہوئی ۔

خان آرزو کے خلاف ہو جانے کی وجہ کیا تھی ؟ اس کا صحیح علم تو کسی کو بھی نہیں ہے ۔ لیکن دو باتیں اس کا سبب ہو سکتی ہیں ۔ ایک تو یہ ہے کہ سوتیلے بھائی ہمیشہ سے ان کے دشمن تھے اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ میر کو دلی میں کوئی مدد ملے اور دوسرے یہ کہ غالباً ان کے عشق کا واقعہ دلی آنے سے قبل اکبر آباد میں ظہور پذیر ہو چکا تھا اور یہ بات اُن کے عزیزوں کو اچھی نہیں لگی تھی ۔ اس لیے انہوں نے اُن پر سختی کو روا رکھا ۔ ”بہار بے خزاں“، کی اس عبارت کو چاہے تسلیم نہ کیا جائے لیکن اس میں شک نہیں کہ ذرا غور سے پڑھنے کے قابل ہے :

”بہ شہر خویش با پری تمثالے کہ از عزیز انش بود در پردۂ تعشق طبع و میل خاطر داشت ۔ آخیر عشق او خاصیت مشک پیدا کردہ می خواست کہ بجیبہ بہ چار سوئے رسوائی کند و حسن بے پردہ بہ جلوہ‌گری در آید ۔ از ننگ افشائے راز از وطن و اقربا یا دلے بغل پروردۂ حسرت و حرماں و با خاطر ناشاد دست وگریباں ، قطع رشتۂ

حب وطن ساختہ از اکبر آباد و بعد از خانہ براندازی ہا بہ شہر لکھنؤ رسید و ہمیں جابہ صد حسرت جاں کاہ جلا وطنی و حرماں نصیبی از دیدار یار و دیار جاں بہ جہانِ آفریں داد ۔ تا بہ قید رشتۂ حیات بود طوقِ محبت در گردن و سلسلۂ دیوانگی بہ پا داشت[1]۔

اس واقعے کی تفصیل ان کی مثنوی خواب و خیال میں بھی نظر آجاتی ہے :

خوشا حال اس کا جو معدوم ہے
کہ احوال اپنا تو معلوم ہے

رہیں جان غم ناک کو کاہشیں
گئیں دل سے نومید سب خواہشیں

زمانے نے رکھا مجھے متصل ،
پراگندہ روزی پراگندہ دل

گئی کب پریشانیٔ روزگار
رہا میں تو ہم طابع زلف یار

وطن میں نہ اک صبح میں شام کی
نہ پہنچی خبر مجھ کو آرام کی

اٹھاتے ہی سر یہ پڑا اتفاق
کہ دشمن ہوئے سارے اہل وفاق

جلاتے تھے مجھ پر جو اپنا دماغ
دکھانے لگے داغ بالائے داغ

---

۱ ۔ تذکرۂ بہارِ بے خزاں (قلمی)

زمانے نے آوارہ چاہا مجھے
مری بے کسی نے نباہا مجھے

رفیقوں سے دیکھی بہت کوتہی
غریبی نے اک عمر کی ہم سری

مجھے یہ زمانہ جدھر لے گیا
غریبانہ چندے بسر لے گیا

بندھا اس طرح آہ بار سفر
کہ لے زاد رہ کچھ نہ بار سفر

دل اک بار سو بے قرار بتاں
غبارِ سرِ رہ گزارِ بتاں

گرفتار رنج و مصیبت رہا
غریبِ دیارِ محبت رہا

چلا اکبر آباد سے جس گھڑی ،
در و بام پر چشم حسرت پڑی

کہ ترکِ وطن پہلے کیونکر کروں
مگر ہر قدم دل کو پتھر کروں

دل مضطرب اشک حسرت ہوا
جگر رخصتانے میں رخصت ہوا

کھنچا ساری رہ دامن چاک دل
رہا برقفا روئے غم ناکِ دل

پس از قطع رہ لائے دلی میں بخت
بہت کھینچے یاں میں نے آزار سخت

جگر جور گردوں سے خوں ہوگیا
مجھے رکتے رکتے جنوں ہوگیا

غرض سبب کچھ بھی ہو دلی میں ان کے قیام کا یہ زمانہ خاصی آزمائشوں کا زمانہ تھا ۔ بے روزگاری ، بے زری اور مفلسی ، مسافرت اور غربت ، بدنامی اور رسوائی ، طعن و تشنیع ، ان سب نے انہیں گھیر رکھا تھا اور ان کی پریشانیوں کی کوئی حد نہیں رہی تھی ۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میر اسی زمانے میں مجنوں ہوگئے ۔ چاند میں انہیں ایک صورت نظر آنے لگی جو ان کی طرف اشارہ کرتی اور انہیں بے خود بناتی ۔ یہ صورت انہیں اس طرح بھائی کہ پھر آس پاس گرد و پیش ہر طرف دکھائی دینے لگی ۔ ہر رات اس سے صحبت رہتی اور ہر صبح بغیر اس کے وحشت چھا جاتی ۔ تمام دن اس کے خیال میں جنوں رہتا ۔ انسان انہیں دیکھ کر بھاگتے اور کنی کاٹتے ۔ خاصا عرصہ ان پر اسی طرح گزرا ۔ خواب و خیال میں اس کی ساری تفصیل موجود ہے ۔ تعویذ ، گنڈے ، جادو ، ٹونے ، ٹوٹکے ، سب کچھ ہوئے ، لیکن کوئی اثر نہ ہوا ۔ بالاخر طبیبوں کے علاج سے فائدہ ہوا اور یہ دیوانگی تو جاتی رہی لیکن ایسے عجیب و غریب اثرات چھوڑ گئی جو زندگی بھر مختلف صورتوں میں میر کے یہاں ظاہر ہوتے رہے ۔

(۵)

میر نے دلی کا پہلا سفر کوئی دس بارہ سال کی عمر میں اپنے والد میر علی متقی اور اپنے منہ بولے چچا سید امان اللہ کے انتقال کے بعد کیا تھا ۔ جب ناسازگار حالات سے پریشان ہوکر وہ تلاش معاش میں گھر سے باہر نکلے تھے ۔ صمصام الدولہ امیر الامراء نے ان کی پرورش کی تھی ۔ لیکن نادر شاہ کے حملے نے ان کی اس ملازمت کو ختم کر دیا تھا

اور وہ پریشان ہوکر پھر اکبرآباد واپس چلے گئے تھے ۔ لیکن اب اکبرآباد میں عرصۂ حیات اُن پر کچھ زیادہ ہی تنگ ہوگیا ۔ کیونکہ سوتیلے بھائی اس عشق کے واقعے کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی ان کے خلاف ہوگئے ۔ چنانچہ انہوں نے میر کو "فتنۂ روزگار" قرار دے کر پھر دلی بھیج دیا ۔ اب کے دلی میں وہ اپنے سوتیلے ماموں سراج الدین علی خان آرزو کے ہاں ٹھہرے ۔ جہاں اُن پر بڑے ستم ڈھائے گئے اور ان کا یہ زمانہ خاصی پریشانیوں میں گذرا ۔ لیکن ان حالات کے باوجود میر نے اپنی تعلیمی اور علمی دلچسپیوں کو قائم اور باقی رکھا ۔ اُن کی ابتدائی تربیت تو میر علی متقی اور میر امان اللہ کے زیر سایہ ہوئی تھی ۔ لیکن جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے ، انہوں نے میر جعفر عظیم آبادی اور سید سعادت علی امروہوی سے فیض حاصل کیا ۔ شعر و شاعری سے طبیعت کو مناسبت تھی اس لیے دس سال کی عمر ہی سے شعر کہنے لگے ۔ انیس بیس سال کی عمر تک پہنچے تو ان کی شاعری کی شہرت دور دور تک پھیل گئی ۔

دلی کے دوران قیام میں خان آرزو سے ان کی نہ بنی اور نوبت دیوانگی تک پہنچی ۔ صحت یاب ہونے کے بعد انہوں نے خان آرزو کے یہاں سے اقامت چھوڑ دی اور مختلف ملازمتیں کرکے گزر اوقات کرتے رہے ۔ رعایت خان اور جاوید خاں کی ملازمتیں کیں ۔ پھر مہا نرائن دیو کے متوسل ہوگئے ۔ راجہ جگل کشور نے بھی کچھ عرصے قدر افزائی کی ۔ راجہ ناگرمل اور رائے بہادر سنگھ سے بھی کچھ نہ کچھ حاصل کرتے رہے ۔ لیکن اسی عرصے میں ابدالی کے حملوں نے دلی کا حال دگرگوں کر دیا ۔ پھر جاٹوں ، مرہٹوں اور روہیلوں نے مغلیہ اقبال کی اینٹ سے اینٹ بجا دی ۔ دلی کا سہاگ لٹ گیا اور ہر شخص اس انتشار اور افراتفری بدنظمی اور طوائف الملوکی سے پریشان ہوکر دلی سے نکلنے کی سوچنے لگا ۔

میر نے بھی دلی چھوڑنے کی ٹھان لی ۔ اس وقت تک ان کی شاعری کا دور دور چرچا ہو چکا تھا ۔ لیکن اب دلی میں ان کی قدر کرنے والا کوئی نہیں تھا ۔ اس لیے ہار کر لکھنؤ جانے کا خیال ان کے دل میں بھی آیا ۔

دلی میں ابھی تک ابتری تھی ۔ اس لیے انھوں نے سوچا کہ شہر سے نکل جائیں ۔ لیکن بے سروسامانی کی وجہ سے معذور تھے ۔ ان کی عزت آبرو کی حفاظت کے خیال سے نواب وزیر الممالک آصف الدولہ بہادر نے یہ سوچا کہ میر اگر ان کے پاس چلے آئیں تو اچھا ہے ۔ انھوں نے میر کو طلب کیا اور ساتھ ہی زاد راہ بھی بھیجا ۔ میر تو ناسازگار حالات کی وجہ سے دل برداشتہ بیٹھے ہی تھے، خط کے آتے ہی لکھنؤ روانہ ہوگئے اور خاصی تکلیفیں اور صعوبتیں برداشت کر کے لکھنؤ پہنچے ۔ آصف الدولہ نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی اور ملازموں کے سلسلے میں داخل کر لیا ۔ میر ۱۱۹۷ھ میں لکھنؤ پہنچے ۔ اس وقت ان کی عمر باسٹھ سال تھی ۔ اس کے بعد سارا وقت انھوں نے لکھنؤ ہی میں گزارا ۔ یہاں ان کی بڑی عزت اور قدر دانی ہوئی اور زندگی کے آخری ایام انھوں نے کسی قدر اطمینان سے گزارے ۔ میر کے شکار نامے جو انھوں نے آصف الدولہ کے بارے میں لکھے ہیں ، وہ اس کا ایک ثبوت ہیں ۔ آزاد نے ان کے قیام لکھنؤ کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس میں ان کی خیال آرائی کو زیادہ دخل ہے ۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ لکھنؤ میں دلی کی یاد انھیں ہمیشہ ستاتی رہی اور اس کے اجڑنے کا غم انھیں مرتے دم تک تڑپاتا رہا ۔

لکھنؤ ہی میں میر کا انتقال ۱۲۲۵ھ مطابق ۱۸۱۰ء میں ہوا ۔ شعبان کی بیس تاریخ تھی ۔ شام کا وقت تھا ۔ اکھاڑہ بھیم کے قبرستان میں دفن ہوئے ۔ اب اس قبرستان کا نام و نشان تک باقی نہیں ۔ کیونکہ جب انگریزوں نے ریل نکالی تو اس قبرستان کو برابر کر دیا گیا ۔ صرف ایک قبر اب وہاں باقی ہے جو ریلوے لائن کے کنارے نشیب میں ہے اور جس کو لوگ اب شاہ جشن کا مزار کہتے ہیں ۔

۳
میر کا ماحول

یہ تو میر کی نجی زندگی سے متعلق کچھ باتیں تھیں جو ان کی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں لیکن ان نجی نوعیت کے حالات کے ساتھ ساتھ اس عہد کے واقعات بھی ان پر اثر انداز ہوئے ہیں۔ بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ میر کی دنیا محدود تھی، انہیں صرف اپنی ذات سے زیادہ دل چسپی تھی اور وہ زندگی بھر انہیں ذاتی معاملات میں الجھے رہے لیکن حقیقت اس کے برعکس یہ ہے کہ انہوں نے اپنے ذاتی معاملات سے زیادہ اپنے زمانے کے حالات سے اثرات قبول کیے ہیں اور اپنے عہد کے سیاسی، معاشرتی، تہذیبی اورادبی ماحول سے گہری دل چسپی کا اظہار کیا ہے۔ "ذکر میر" میں ان کے زمانے کے تاریخی، سیاسی اور معاشرتی حالات کی اتنی تفصیل و جزئیات ہے کہ شاید اتنی تفصیل و جزئیات خود اپنے ذاتی حالات کے بیان میں بھی نہیں۔ اس لیے ان حالات کا مطالعہ ان کے مطالعے میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ان حالات سے میر کی غیر معمولی دل چسپی اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ انہوں نے

ان سے گہرے اثرات قبول کیے ہیں اور یہ کہ ان کے پاس ان حالات کو سمجھنے کا گہرا شعور موجود تھا ۔

میر نے جس وقت آنکھ کھولی تو دیکھا کہ سلطنت مغلیہ کا اقبال گہنا رہا ہے ۔ اورنگ زیب عالم گیرؒ کے بعد مغلوں کی سلطنت میں جو انحطاط رونما ہوا اور اس کے نتیجے میں جو ہنگامے ہوئے اور جس انتشار اور افراتفری ، طوائف الملوکی اور ابتری سے زندگی دوچار ہوئی ، ان سب کو میر نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے ۔ اور چونکہ اس زمانے کی ساری زندگی ان حالات سے متاثر تھی اس لیے میر بھی ان سے متاثر ہوئے ہیں ۔

(۲)

جب تک میر کا قیام اکبر آباد (آگرے) میں رہا اس وقت تک انہیں ان حالات کا احساس و شعور ایسا کچھ زیادہ نہیں ہوا ۔ کیونکہ ابھی تک وہ بہت چھوٹے تھے اور اکبر آباد (آگرہ) دلی کے مقابلے میں ان حالات سے کسی حد تک محفوظ تھا ۔ کم از کم وہاں انحطاط کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ماحول کا اثر اتنا شدید نہیں تھا جتنا کہ دلی میں تھا ۔ پھر ایک بات یہ بھی تھی کہ میر اس زمانے میں میر علی متقی اور سید امان اللہ کے زیر سایہ ایک درویشانہ ماحول میں زندگی بسر کر رہے تھے ۔ ظاہر ہے اس ماحول میں آس پاس اور گرد و پیش کے حالات کو دیکھنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا ۔ وہاں تو قناعت اور گوشہ نشینی ، توکل اور عزلت گزینی تھی ۔ اس لیے میر کو اس زمانے میں زندگی کے تغیرات کا احساس نہ ہونے کے برابر تھا ۔ یہ احساس تو ان کے یہاں اس وقت بیدار ہوا اور اس زمانے میں اس نے شدت اختیار کی ، جب میر اپنے والد کے انتقال کے بعد اس دنیا میں بے یار و مددگار رہ گئے ، اور انہیں اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لیے آگرے سے باہر نکل کر دلی جانا پڑا جو اس زمانے میں تمام ہنگاموں کی آماجگاہ تھی ۔ جہاں انتشار اور افراتفری نے اپنے ڈیرے ڈال لیے تھے ۔ دلی میں میر کے قیام کا زمانہ اس اعتبار سے بہت اہم ہے ۔ نادرشاہ کا حملہ اسی زمانے میں ہوا ابدالی کے ہاتھوں دلی اسی زمانے میں تاراج ہوئی ۔ مرہٹے اسی زمانے میں دلی تک پہنچ کر

انتشار کا باعث بنے ۔ روہیلوں نے اسی زمانے میں وہ مظالم کیے جن کی مثال تاریخ میں مشکل ہی سے مل سکتی ہے ۔ میر نے ان تمام واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور حقیقت یہ ہے کہ ان کی اپنی پریشانیوں اور الجھنوں میں ان واقعات کا بڑا ہاتھ ہے ۔

میر نے ابھی بچپن کو خیرباد کہہ کر جوانی کی سرحد میں قدم رکھا تھا اور بے شمار پریشانیوں کے بعد صمصام‌الدولہ امیرالامرا کے روزینے کی صورت میں انھیں ذرا سا سہارا ملا تھا کہ نادر شاہ نے دلی پر حملہ کیا ۔ یہ حملہ کیا تھا قہر الٰہی تھا ۔ اس کی وجہ سے مغلیہ حکومت کی بنیادیں ہل گئیں ۔ لڑائی ہوئی ، ہزارہا انسان مارے گئے ۔ قتل عام ہوا لاتعداد بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ۔ ہزاروں نے اپنی عزت بچانے اور اس پریشانی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے خود کشی کر لی ۔ بڑی لوٹ مار ہوئی ۔ کروڑوں روپے کی مالیت کا سامان لے کر نادر شاہ دلی سے رخصت ہوا ۔ دلی اجڑ گئی اور بڑے بڑے امرا و رؤسا فقیر ہوگئے ۔ صمصام‌الدولہ ، جنھوں نے میر کی پرورش کی تھی ، وہ بھی اس ہنگامے میں مارے گئے ۔

یہ ہنگامے یہیں پر ختم ہو جاتے تو صبر تھا لیکن ان کا سلسلہ تو آئندہ بھی برسوں تک جاری رہا ۔ نادر شاہ واپس گیا تو اس کے چند سال بعد احمد شاہ ابدالی کے حملے شروع ہوئے ۔ مغلوں کے یہاں افراتفری تو پہلے ہی سے موجود تھی ۔ آپس کی رنجشیں انتہا کو پہنچ گئی تھیں ۔ اس لیے بعض امرا خود ابدالی کے ساتھ ہوگئے ۔ بلکہ اس کو حملہ کرنے کی دعوت تک دے دی ۔ غرض احمد شاہ ابدالی آیا اور چند سال تک اس کے حملوں کا سلسلہ جاری رہا ۔ لاہور اس نے فتح کر لیا اور بالآخر دلی میں بھی اس کے نام کا خطبہ پڑھا گیا ۔ دلی میں ابدالی کا آنا بھی قیامت سے کم نہ تھا ۔ اس کے لشکر نے وہ اودھم مچایا کہ لوگ نادر شاہ کے حملے اور اس کے قتلِ عام کو بھول گئے ۔ نادر کی تلوار تو صرف دلی ہی میں چمکی تھی ۔ احمد شاہ ابدالی نے تو دلی کے آس پاس کے علاقوں کو بھی تباہ و برباد کر دیا ۔ جس راستے سے بھی

اس کا لشکرگزرا ، دور دور تک تباہی اور ویرانی نے اپنے پر پھیلا دیے۔ کروڑوں روپے کی دولت ابدالی اپنے ساتھ لے گیا ۔ شریف عورتوں کی وہ آبرو ریزی ہوئی کہ اس سے قبل کبھی نہیں ہوئی تھی ۔ بڑے بڑے امرا اور شرفا منہ دیکھتے رہ گئے اور کچھ نہ کر سکے ۔ غرض ابدالی کے ہنگاموں نے سارا نظام درہم برہم کر دیا ۔ نظام پہلے ہی کب تھا ۔ اب تو رہی سہی بات بھی ختم ہوگئی ۔

مرہٹوں اور جاٹوں نے ان ہنگاموں سے فائدہ اٹھایا ۔ ان کی فوجیں دلی تک پہنچ گئیں اور انھوں نے دلی اور اس کے آس پاس کے علاقوں کو خوب لوٹا ۔ پنجاب میں سکھوں نے آفت مچا دی اور اس طرح مغلوں کا اقتدار ختم ہوگیا ۔

میر نے ان تمام واقعات کی تفصیل ''ذکر میر'' میں پیش کی ہے ۔ انھوں نے خود ان ہنگاموں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا ۔ کیونکہ وہ ملازمت کے سلسلے میں بعض ایسے امیروں کے ساتھ تھے جنھیں ان ہنگاموں سے دوچار ہونا پڑا ۔ اسی لیے ''ذکر میر'' اس زمانے کے واقعات کی حقیقت سے بھرپور تصویریں پیش کرتی ہے ۔

(۳)

ان ہنگاموں کی واقعاتی تفصیل اپنی جگہ پر اہم سہی لیکن اس سے زیادہ اہم یہ بات ہے کہ اس زمانے میں ان ہنگاموں نے معاشرتی اور تہذیبی زندگی کا کیا حال کر دیا تھا ۔ میر نے اس کی طرف بھی اشارے کیے ہیں اور معاشی معاشرتی اور تہذیبی زندگی کا اس وقت جو حال ہوگیا تھا ، اس کی وضاحت بھی خاصی تفصیل سے کی ہے ۔ ان کے ایک ایک فقرے سے اس زبوں حالی کا اندازہ ہوتا ہے ۔ ان کی ایک ایک بات جو انھوں نے اس سلسلے میں کہی ہے ، اس سے پتہ چلتا ہے کہ انھیں اس زبوں حالی کا کتنا غم تھا ۔

دلی کی حکومت کے کمزور ہو جانے کی وجہ سے اس کی مرکزیت ختم ہوگئی تھی ۔ اندرونی خلفشار بڑھ گیا تھا جو جس علاقے کا منتظم اور صوبے دار تھا وہ اپنے آپ کو وہاں کا حکمران تصور کر بیٹھا تھا ۔

انہیں اپنے مرکز سے کوئی دل چسپی نہیں تھی - اس کے ساتھ کوئی لگاؤ نہیں تھا - مرکز کے حکمران کسی کام کے نہیں تھے - انہوں نے جی چھوڑ دیا تھا ، ہمت ہار دی تھی - لایعنی ، بے کار اور مہمل باتوں میں وہ اپنا وقت ضائع کرتے رہتے تھے - بیرونی حملہ آوروں نے اس سے فائدہ اٹھایا - موقعے کو غنیمت جان کر انہوں نے بار بار ہندوستان پر حملے کیے- نتیجہ یہ ہوا کہ رہی سہی قوت بھی ختم ہوگئی - نظامِ مملکت نے دم توڑ دیا اور معیشت کی بنیادیں ہل گئیں - ظاہر ہے ان حالات میں پریشانی اور زبوں حالی کا دور دورہ تو ہونا ہی چاہیے تھا -

یہ پریشانی اور زبوں حالی صرف سیاسی ہی نہیں تھی - معاشرتی زندگی پر بھی اس کا اثر ہوا تھا اور افراد ان حالات کی وجہ سے مصیبت میں مبتلا تھے - آئے دن کی ابتری نے ان کا ناک میں دم کر رکھا تھا - انہیں یہ خبر نہیں تھی کہ کل کیا ہونے والا ہے - مفلسی عام ہوگئی تھی -کیونکہ نظامِ معیشت نے سیاسی ابتری کی وجہ سے جواب دے دیا تھا - اس لیے چھوٹے اور بڑے ، امیر اور غریب سب افلاس کے شکار تھے - مفلسی اخلاق کی دشمن ہوتی ہے - ان حالات میں بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں اور انسانی قدروں کا خیال بہت کم باقی رہ جاتا ہے - انسان ایسی حرکتیں کرنے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے جن سے اخلاق قدروں کی نفی ہوتی ہے - انسان اور انسانیت کا خیال دلوں میں باقی نہیں رہتا - انسان اپنی ہوس کا بندہ ہو جاتا ہے - چنانچہ کچھ ایسے ہی حالات اس زمانے میں بھی پیدا ہوئے - اس زمانے میں انسانوں نے عجیب عجیب حرکتیں کیں - عجیب عجیب گناہ اور عجیب عجیب جرائم ان سے سرزد ہوئے - تہذیب کا خیال ان حالات میں بھلا کہاں باقی رہ سکتا ہے - افراد اس زمانے میں اپنی روایات کو بھول گئے - اپنے تہذیبی ورثے کا انہیں بہت کم خیال آیا - ثقافت کی جگہ ہوس کاری اور عیاشی نے لے لی اور زندگی کا کوئی معیار نہ رہا - جن کے پاس معیار تھے انہوں نے اپنے آپ کو اس ماحول میں اجنبی پایا اور ایسے لوگوں کی زندگی ایک المیہ بن گئی -

میر ان حالات کے خاموش تماشائی تھے - ان کے پاس زندگی کے

بعض معیار تھے ۔ انسانیت کی کچھ قدروں کا خیال تھا ۔ اس لیے اس ماحول کے لیے وہ بالکل اجنبی ہوگئے اور یہ ماحول ان کے لیے اجنبی ہوگیا ۔

(۲)

اس زمانے کے سیاسی ، معاشرتی ، معاشی اور تہذیبی حالات کو میر نے ذکر میر میں خاصی تفصیل سے پیش کیا ہے ۔ البتہ اس وقت شاعری کا جو حال تھا ، اس کی وضاحت کہیں بھی نہیں کی ہے ۔ نکات الشعرا سے البتہ کسی قدر اس زمانے کے شاعرانہ ماحول اور ادبی فضا کا اندازہ ہوتا ہے لیکن ''ذکر میر'' میں اس ماحول کا مطلق ذکر نہیں ہے ۔ ویسے اس کتاب میں اس کے علاوہ بہت کچھ ہے لیکن اس کے پڑھنے کے بعد ایک بات کی حسرت رہ جاتی ہے کہ میر نے اپنے زمانے کی شعر و شاعری ، مشاعروں اور ہم عصر شعرا کا مطلق ذکر نہیں کیا ۔ حالانکہ اس وقت اردو شاعری کا دلی میں خوب چرچا تھا ۔ خود بادشاہ شاعر اور شاعروں کے قدردان تھے ۔ اس کے علاوہ میر درد ، میر سوز ، سودا ، میر حسن ، میر اثر اور بہت سے نامور شاعر وہاں موجود تھے ۔ خود میر اپنے تذکرے نکات الشعرا میں لکھتے ہیں کہ مجلسِ ریختہ خواجہ صاحب کے ہاں ہر مہینے کی پندرھویں کو ہونے لگی ۔ حیرت ہے کہ میر نے اس کتاب میں بھول کر بھی اس کی طرف کہیں اشارہ نہیں کیا اسے یا تو میر کا عجز سمجھنا چاہیے یا یہ کہ یہ چیزیں انہوں نے نکات الشعرا کے لیے اٹھا رکھی تھیں ۔ جو کچھ بھی ہو مگر یہ بات ہے بڑے تعجب کی ، کہ آپ بیتی میں اس پہلو کا ذکر نہ ہو جو میر صاحب کا سب سے بڑا کمال ہے اور جس سے ان کو بقائے دوام ہے[1] ۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ میر سیاسی حالات کو پیش کرنے میں الجھے رہے اور ان حالات کا اثر ان پر اتنا گہرا تھا کہ انہوں نے شعر و شاعری کو فراموش کر دیا ۔

خیر تو میر کے تذکرے نکات الشعرا اور بعض دوسرے ذرائع سے اس زمانے کی ادبی و شعری زندگی کے اس پہلو پر خاصی روشنی پڑتی ہے ۔ جہاں تک شعر و شاعری کا تعلق ہے یہ زمانہ اس اعتبار سے خاصا اہم

---

۱ ۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق ، مقدمۂ ذکر میر ، ص

تھا ۔ اردو شاعری اس وقت تک خاصی ترقی کر چکی تھی ۔ شعر کو جانچنے اور پرکھنے کے اعلیٰ معیار بن چکے تھے ۔ شاعری میں ایہام گوئی کی جو تحریک اس سے قبل چل نکلی تھی ، اس کا خاتمہ اسی دور میں ہوا ۔ حاتم ایسا کرنے میں پیش پیش رہے تھے ۔ خود میر نے اس سلسلے میں بہت کچھ کیا ہے ۔ میر کے زمانے میں شعر کے اعلیٰ معیاروں کے عام ہونے کے بعد شاعری نے تیزی سے آگے قدم بڑھانا شروع کر دیا تھا ۔ مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی جا رہی تھی ۔ لیکن غزل نے اس زمانے میں خاص طور پر اپنے آپ کو پانے کی کوشش کی تھی اور اس میں شک نہیں کہ اس زمانے میں اس کا معیار بہت بلند ہوگیا تھا ۔ اس میں عشق کے اعلیٰ معیار اور تصورات پیش کیے جاتے تھے ۔ اوچھے خیالات کا اظہار اور سستے پن کے ساتھ ان کی ترجمانی کو برا سمجھا جاتا تھا ۔ پھر غزل صرف عشقیہ واردات و کیفیات کی ترجمانی ہی تک اس زمانے میں محدود نہیں رہی تھی ۔ اس کے دامن کو تو اس زمانے میں وسیع کیا گیا تھا اور اس میں دوسرے مضامین بھی داخل کیے گئے تھے ۔ تصوف اس زمانے کی غزل کا خاص موضوع تھا اور اس کے توسط سے حیات و کائنات کے ان گنت مسائل کی ترجمانی بھی اس میں عام ہوگئی تھی ۔ معاشی ، معاشرتی حالات کی ترجمانی کو بھی اس میں نظرانداز نہیں کیا گیا تھا اور پھر غزل کی زبان کو فن کی صورت دینے کا تجربہ بھی اس زمانے میں کیا جا رہا تھا ۔ غرض غزل اس زمانے میں ترقی کی راہوں پر گامزن تھی ۔

غزل کے ساتھ ساتھ مثنوی ، مخمس ، مسدس ، ترجیع بند ، ترکیب بند سب سے اس زمانے کے شاعر کام لے رہے تھے ۔ اس کے لیے صرف موضوع کی مناسبت اور اس کے ساتھ ہم آہنگی شرط تھی ۔ پھر اس زمانے میں اعلیٰ درجے کے شاعر موجود تھے ۔ شاید ایسے اور اتنے شاعروں کا اجتماع دلی میں اس کے بعد پھر کبھی نہیں ہوا اور ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی جگہ ایک اجتہادی شان رکھتا تھا ۔ شاہ حاتم ، خواجہ میر درد ، میرزا سودا ، میر اثر ، مرزا مظہر جان جاناں ، یکرنگ ، فغاں سب اپنی اپنی جگہ اہم تھے اور انہوں نے اپنے زمانے میں اردو شاعری کو آگے بڑھانے میں نمایاں حصہ لیا تھا ۔ زبان کو سنوارنے اور نکھارنے کی طرف

بھی توجہ عام تھی اور اس زمانے کے تمام شاعر اس کام میں پیش پیش تھے ۔

(۵)

غرض یہ کہ زندگی کے صرف ایک ہی شعبے میں اس وقت زندگی کی رمق تھی ۔ صرف ایک ہی پہلو ایسا تھا جس میں ترقی کے کچھ آثار نظر آتے تھے اور وہ ہے شاعری ۔ عوام کو بھی اس سے لگاؤ تھا اور شاہان وقت (جن کی حیثیت اس وقت شطرنج کے پٹے ہوئے مہروں سے زیادہ نہیں تھی) بھی اس سے حتی‌الامکان دل چسپی لیتے تھے ۔ برے حال میں بھی کوئی نہ کوئی کسی شاعر کو کچھ دے ہی بھاگتا تھا ۔ بہرحال شعر و شاعری کا اس زمانے میں خاصا ماحول تھا اور وہ ترقی کی طرف گامزن تھی ۔ حالانکہ خود زندگی میں انحطاط تھا ۔ ماحول میں انتشار اور ابتری تھی ۔ لیکن یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ شاعری ایسے ہی ماحول میں ترقی کرتی ہے جب ساری زندگی سے معیاروں کا خیال اور قدروں کا احساس اٹھ جاتا ہے ۔ اس وقت شاعر سامنے آتا ہے اور زندگی کی تاریک راہوں میں اپنے افکار و خیالات سے مشعلیں سی فروزاں کرتا ہے جس سے روشنی پھیلتی ہے ، راہیں جگمگاتی ہیں اور اس کی روشنی میں زندگی کا قافلہ آگے کی طرف بڑھتا ہے ۔ اس زمانے کے شاعرانہ اور ادبی ماحول کی بھی کچھ ایسی ہی کیفیت نظر آتی ہے ۔ اس ماحول کے آس پاس اندھیرا ہی اندھیرا ہے ۔ معاشرت میں اندھیرا ، تہذیب میں اندھیرا لیکن صرف شعر و ادب کی دنیا میں اندھیرا نہیں ہے ۔ یہاں تو اجالا ہی اجالا ہے ۔ اس زمانے میں شعر و ادب زندگی کو روشنی بہم پہنچاتے نظر آتے ہیں ۔

میر نے اس اجتماعی ماحول میں زندگی بسر کی ۔ ان کے گرد و پیش یہ سیاسی ، تہذیبی ، معاشی ، معاشرتی اور ادبی و شعری حالات تھے ۔ س ماحول کے اثرات ان پر بڑے گہرے اور ہمہ‌گیر ہیں ۔ کیونکہ ان کا

اس ماحول سے گہرا تعلق رہا ہے ۔ انھوں نے انھی حالات کے سائے میں
زندگی بسر کی ہے انھیں حالات سے ہو کر گزرنا پڑا ہے ۔ اس لیے وہ ان
حالات ہی کی پیداوار ہیں اور یہ حالات ان کے یہاں مختلف زاویوں سے اپنے
آپ کو رونما کرتے ہیں ۔

۴

میر کی شخصیت

میر کے حالات زندگی سے پتہ چلتا ہے کہ وہ نسلاً ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے تھے ۔ ان کی شرافت و نجابت مسلم ہے ۔ ان کی رگوں میں عرب خون تھا اس لیے اس کی بنیادی خصوصیات کا عکس ان کی شخصیت میں بھی نظر آتا ہے ۔ میر کے مزاج میں جو گرمی ہے ، ان کی طبیعت میں جو شدت اور انتہا پسندی ہے ۔ وہ درحقیقت ان کی نسلی خصوصیت ہے ۔ حمیت اور غیرت جو ان کے یہاں سب سے زیادہ نمایاں ہے ، اس کے پیچھے بھی ان کی نسلی خصوصیت کا ہاتھ کارفرما نظر آتا ہے ۔ میر کے یہاں جو نیکی اور شرافت ہے ، ان کے کردار میں وہ جو ایک استواری اور ثابت قدمی ، بلندی اور بلند آہنگی ، ایثار اور قربانی ، وقار اور سپردگی کی خصوصیات ہیں ، وہ سب کی سب بڑی حد تک ان کی نسلی خصوصیات کی آئینہ دار ہیں ۔

(۲)

اس میں شک نہیں کہ نسلی طور پر میر ایک بلند مقام رکھتے ہیں اور اس میں بھی کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ ان کی شخصیت

میں قدم قدم پر اس کے اثرات ملتے ہیں لیکن میر کے خاندان کو جن
ناسازگار حالات سے دوچار ہونا پڑا ، اس کے اثرات بھی ان پر کچھ
کم گہرے نہیں ہیں ۔ میر نے خود لکھا ہے کہ ان کے خاندان کو
بڑی بڑی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا ۔ عسرت اور زبوں حالی ہمیشہ
ان کے آبا و اجداد کے ساتھ رہی ۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ان کے خاندان
والے اپنے وطن ہی کو کیوں خیرباد کہتے ۔ انہوں نے اپنے وطن کو
چھوڑ کر ہندوستان میں جو اقامت اختیار کی ، اس کا سبب یہی ہے کہ
انہیں وہاں اطمینان نصیب نہیں تھا ۔ وہ ہندوستان آنے کو تو آ گئے
لیکن ان کے خاندان کے جو حالات ہم تک پہنچے ہیں ، ان سے اس بات
کا پتہ چلتا ہے کہ یہاں بھی وہ خوش نہ رہے ۔ افلاس ہمیشہ ان کے
ساتھ رہا ۔ کبھی ذرا سنبھلے بھی تو کسی ناگہانی مصیبت نے آ لیا ، اور
جو کچھ وہ کرنا چاہتے تھے نہ کر سکے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تقریباً سب نے
عسرت اور پریشانی میں زندگی بسر کی ۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس خاندان
کے حالات بد سے بدتر ہوتے گئے ۔

میر نے آنکھ کھول کر دیکھا تو انہیں اپنے خاندان میں دور دور
تک پریشانی اور زبوں حالی نظر آئی ۔ عسرت اور افلاس کا دور دورہ
دکھائی دیا ۔ میر کا اس سے متاثر ہونا لازمی تھا ۔ وہ اس صورت حال
سے متاثر ہوئے ہیں اور ان کی شخصیت میں زندگی سے علیحدگی اور اس کی
رونقوں سے ایک طرح کی بیزاری کا جو احساس ملتا ہے وہ بڑی حد تک
اسی کا نتیجہ ہے ۔ یہ حقیقت ہے کہ میر نے ساری زندگی اپنی دنیا الگ
بنانے کی کوشش کی ہے ۔ وہ اپنے آپ میں گم ہوگئے ہیں ۔ انہوں نے
اپنے آپ سے باہر نکل کر بہت ہی کم دیکھا ہے ۔ انہیں ہر چیز پر اداسی
اور سوگواری برستی نظر آئی ہے ۔ اس لیے کہ انہوں نے خود جو کچھ
اپنے نجی اور خاندانی ماحول میں دیکھا ، اس میں سوائے ان باتوں کے
اور کچھ نہیں تھا ۔ اس لیے میر زندگی کے بارے میں اس طرح سوچنے
کے لیے مجبور تھے ۔ اس کے برخلاف سوچنا ان کے بس کی بات نہیں تھی ۔
میر کی شخصیت میں شگفتگی کا فقدان ہے جو بظاہر بہت عجیب معلوم
ہوتا ہے لیکن ان کے خاندانی حالات کی زبوں حالی کو سامنے رکھا جائے

تو اس کی حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے اور وہ عجیب معلوم ہونے کے بجائے میر کی شخصیت کا ایک فطری پہلو نظر آنے لگتا ہے۔

وہ تو کہیے میر اور میر کے خاندان کو درویشی کی روایت کا سہارا مل گیا ورنہ زندگی میں جن حالات سے انھیں سابقہ رہا، ان میں زیست ممکن نہیں تھی۔ اس درویشی نے میر کے بزرگوں کو اپنی ذات میں مگن رہنا سکھایا۔ توکل اور قناعت کی اہمیت ذہن نشین کرائی، مادیت سے چشم پوشی کا درس دیا، روحانیت کے تصورات عام کیے۔ زندگی کے اعلیٰ معیاروں کا احساس دلایا، ارفع قدروں کی طرف توجہ مبذول کرائی، حیات و کائنات کی بے ثباتی کا خیال پیدا کیا، جذب و شوق کو ان کا نصب‌العین بنایا۔ میر کی شخصیت میں یہ تمام باتیں موجود ہیں۔ ان کی درویشی اور قلندری میں بھلا کس کو شبہ ہو سکتا ہے۔ یہ درویشی اور قلندری ان تک اپنے بزرگوں کے توسط سے پہنچی ہے، خاص طور پر ان کے والد میر علی متقی——اور منہ بولے چچا—— میر امان اللہ کی شخصیتوں کا اس میں بڑا ہاتھ ہے——ان دونوں کے گہرے اثرات ہی نے میر صاحب کو ایک درویش اور قلندر بنایا ہے اور وہ تمام خصوصیات ان کی شخصیت میں پیدا کر دی ہیں، جنھوں نے انھیں زندگی کے ایک مخصوص تصوّر سے آشنا کیا ہے۔

(۳)

میر کی شخصیت میں تصوف کے اثرات بھی بڑے گہرے ہیں۔ یہ تصوف انھیں ورثے میں ملا ہے اور اس نے انھیں زندگی کو ایک مخصوص زاویے سے بسر کرنا سکھایا ہے۔ میر زندگی کے مادی پہلوؤں سے بڑی حد تک بے نیاز نظر آتے ہیں۔ انھیں اپنے آس پاس اور گرد و پیش سے ایسی کچھ زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔ برخلاف اس کے وہ اپنی ذات سے زیادہ سروکار رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی میں وہ جس مسئلے سے بھی دوچار ہوئے ہیں، اس کو انھوں نے ذاتی اور انفرادی زاویۂ نظر سے دیکھا ہے اور ان کے یہاں جو بے اندازہ داخلیت نظر آتی ہے، اس کا بنیادی سبب بھی یہی ہے۔ میر کو تصوف کے توسط سے

زندگی کے اعلٰی معیار بھی ملے ہیں ۔ اس لیے وہ کسی جگہ بھی اپنی سطح سے نیچے نہیں کرتے ۔ زندگی کا ایک معیار ہمیشہ ان کے پیشِ نظر رہا ہے ۔ اخلاق کے بعض اصول ہر حال میں ان کے سامنے رہے ہیں ۔ انھوں نے کبھی کسی کی پروا نہیں کی ، جو کچھ محسوس کیا اور سوچا ، اس کا بے باکی کے ساتھ اظہار کیا ہے ۔ اس اظہار میں چونکہ بے ساختگی اور برجستگی زیادہ ہے ، اس لیے میر کے طرزِ عمل میں ہر جگہ ایک سادگی کا احساس ہوتا ہے اور ایک فطری کیفیت نظر آتی ہے ۔ تصوف سے گہرے لگاؤ نے میر کے یہاں احساس کی شدت کو بڑھایا ہے ۔ اسی کے اثر سے وہ زندگی بھر حد درجہ جذباتی رہے ہیں ۔ محسوسات کے دائرے سے نکل کر انھوں نے زندگی میں بہت کم کوئی کام کیا ہے ۔ کبھی کبھی ایسا ہوا ہے کہ وہ اپنی ذات سے باہر نکلے ہیں تو انھوں نے اس تصوف کے زیر اثر حیات و کائنات کے بعض بنیادی معاملات و مسائل سے دل چسپی کا اظہار کیا ہے ۔ لیکن ان کے اظہار میں بھی ان کا انداز جذباتی اور محسوساتی رہا ہے ۔ اسی لیے وہ فلسفیانہ باتیں کرنے کے باوجود کبھی فلسفی نہ بن سکے ۔ ویسے فلسفیانہ معاملات و مسائل سے انھوں نے دلچسپی کا اظہار ضرور کیا ہے ۔ لیکن ان سب کا محور ایک ہی ہے ۔ یعنی ذاتِ الٰہی اور معرفتِ الٰہی ۔ میر نے اپنے افعال و اقوال سے ہر جگہ اس خیال کو ظاہر کیا ہے کہ ذاتِ الٰہی ہی ہر چیز کا مرکز محور اور بنیاد ہے اور اس خیال نے ان کی شخصیت میں ایک رکھ رکھاؤ اور وقار پیدا کیا ہے ۔ ان کے یہاں وہ جو ایک لیے دیے رہنے والی کیفیت نظر آتی ہے ، اس کی اصل وجہ بھی یہی ہے ۔ لیکن میر کی شخصیت میں اس تصوف نے جس پہلو کو سب سے زیادہ نمایاں کیا ہے وہ انسانیت کا خیال اور انسانی قدروں کا احساس ہے ۔ میر کی شخصیت میں انسانی زندگی کی کامیابیوں اور کامرانیوں ، حسرتوں اور ناکامیوں دونوں کا شدید احساس نظر آتا ہے ۔ میر انسان اور انسانی زندگی کو سمجھتے ضرور ہیں ۔ وہ اس کے بنیادی معاملات کا شعور ضرور رکھتے ہیں ۔ یہ صحیح ہے کہ ان کے یہاں اس کی المناکی کا احساس نسبتاً زیادہ ہے لیکن وہ اس کی مسرتوں سے بھی ناواقف نہیں ہیں ، بلکہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ انسانی

زندگی ان دونوں پہلوؤں سے عبارت ہے ۔ انسان کی بڑائی اس میں ہے کہ وہ مسرتوں کے ساتھ غموں کو بھی برداشت کرتا ہے ۔ اسی لیے میر انسان کے ساتھ ایک ہمدردی رکھتے ہیں ۔ انھیں انسانی زندگی سے محبت ہے ۔ شاید اسی لیے کہ انسان انھیں عظیم نظر آتا ہے اور عظیم اس لیے نظر آتا ہے کہ وہ اس دنیا میں مجبور و معذور ہونے کے باوجود اس سے نبرد آزما ہوتا ہے ۔ انسان کی اس عظمت کے خیال اور احساس نے خود میر کی شخصیت میں ایک عظمت پیدا کر دی ہے ۔ ان کی زندگی کے مد و جزر کو دیکھیے اور ان کے کلام کو پڑھیے تو قدم قدم پر اس حقیقت کا احساس ہوتا ہے کہ وہ ایک عظیم انسان ہیں ، اور ان کا کلام بھی عظمت سے ہم کنار ہے ۔

ایک خاصا زمانہ میر کی زندگی میں ایسا گزرا ہے جب وہ فقیروں اور درویشوں کے ساتھ رہے ہیں ۔ اپنے والد میرعلی متقی اور اپنے منہ بولے چچا سید امان اللہ سے قطع نظر ، ان دونوں بزرگوں کی وساطت سے انھیں بعض درویش ایسے بھی ملے ہیں جن کی نصیحتوں نے ان کی شخصیت کو ایک مخصوص سانچے میں ڈھالا ہے ۔

''ذکر میر'' میں ان ملاقاتوں کا حال میر نے خاصی تفصیل سے لکھا ہے ۔ اس تفصیل میں جو کام کی چیز ہے ، وہ درویشوں کے پند و نصائح ہیں جن سے میر نے اثر قبول کیا ہے ، اور جس کی صدائے بازگشت ان کی شخصیت اور فن میں جگہ جگہ سنائی دیتی ہے ۔ میر نے لکھا ہے کہ ان کے چچا امان اللہ درویشوں سے ملنے کے بہت شوقین تھے چنانچہ جب بھی کسی خدا رسیدہ فقیر کی خبر ملتی تو اس سے ملنے جاتے اور خود میر کو بھی ساتھ لے جاتے ۔ ایک دفعہ وہ ایک فقیر کے پاس گئے جو شب و روز یادِ الٰہی میں محو رہتا تھا اور اسے دنیا میں کسی چیز کی پروا نہیں تھی ۔ اس نے جو نصیحتیں کیں ، ان کا نچوڑ میر کے الفاظ میں یہ ہے :

''اے عزیز ! اگر آں محبوب سراپا ناز پیش چشم است ، بهشت جاوید ، و اگر از نظر رفت ، پہاں دوزخِ عاشقِ نا آمید بدانکہ

سر کلاہ پیدا نمی شود ۔ یعنی بر ما ہیچ ہویدا نیست ۔ نمی دانیم
کہ زاہدان ریاضت پیشہ چہ در سردارند و بے خودانِ شوقِ آن
مست سر انداز ۔ کہ خبر ۔ جمعے را خلشِ خواہشے ، جماعتے را
کاوشِ کاہشے ۔ کسانیکہ حق شناسند مبرا از امید و یاس اند ۔
عزیزانے کہ باخدایند ، دل دادگان رضامند ۔ جانِ عاشقان را کہ
بہ تلخی کار است ، خونِ ایشاں شیریں بسیار است ۔ رنج را برخود
گوارا کن تا شایانِ راحت شوی کار را بسیار با خود تنگ بگیرتا
بہ فراغت روی ۔ دل برداشتن ازیں عالم خوب است ، اگر معرفت
حق میسر نہ شود ، ایں ہم خوب است ۔ عمارتِ دنیا در گردیدنی
است ۔ بنائے ایں بروہم گزاشتہ اند ۔ اگر بہ مقصود رسیدنی خواہی،
در دلے راہ کن ، ہر چہ از دستِ کوتاہ خدمتت بر آیدللہ کن ۔
اگر آشنائے دریائے تہ دارِ حقیقت نمی توانی شد ، بارے بر کراں
باش ، یعنی اگر دفعۃً بر مردنِ خود قادر نیستی ، آمادۂ دادنِ
جاں باش خود را از قیدِ دیر و مسجد دارہاں ، یعنی باخدا باش و
در ہمہ جا بماں[۱] ۔"

ان نصیحتوں نے میر کو میر بنا دیا اور اسی قسم کی نہ جانے کتنی
نصیحتوں کی آوازیں ان کے کانوں میں پڑتی رہیں ۔ ان کے اثرات میر پر
ہونے ہی چاہیے تھے ۔ چنانچہ یہ اثرات ہوئے ۔ کیونکہ درویشوں اور
فقیروں کی صحبت جو انہیں میسر تھی اور ان صحبتوں میں جو باتیں ہوتی
تھیں ، ان سے میر کا متاثر ہونا ناگزیر تھا ۔

(۴)

میر کی شخصیت میں مادی زندگی سے بے نیازی اور اس کے نتیجے
میں وہ جو ایک بے دماغی ملتی ہے ، اس کی تہ میں بھی ان درویشوں
اور فقیروں کی صحبتوں اور نصیحتوں کا ہاتھ ہے ۔ میر نے زندگی میں
ایسے ایسے خدا رسیدہ لوگوں کو دیکھا ، اور وہ ایسے ایسے بزرگوں کے
ساتھ رہے جو بڑے بڑوں کو خاطر میں نہیں لاتے تھے ۔ جن کی اپنی

---

۱ ۔ ذکر میر ، ص ۳۶ ، ۳۷ ۔

ایک دنیا تھی اور وہ اس دنیا میں مست تھے - میر نے بھی زندگی بھر کسی کی پروا نہیں کی ، کیونکہ وہ بھی اپنے حال میں مست رہے - انہیں امرا اور رؤسا سے ساری زندگی کوئی دل چسپی نہیں رہی - کیونکہ درویشوں کی صحبتوں نے تو انہیں یہ سکھایا تھا کہ دنیا کی ہر چیز فنا ہو جانے والی ہے اور عزت ، دولت ، ثروت اور شہرت کو اس زندگی میں کوئی پائیداری حاصل نہیں - پائیداری اور استواری تو صرف خودداری کو حاصل ہے - چنانچہ خودداری کا احساس میر کی شخصیت میں بہت نمایاں ہے اور اس خودداری نے ان کی شخصیت اور فن میں بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں - ان کے بہت سے تصورات اسی خودداری کے گرد گھومتے ہیں - آزاد نے جس کو ان کی بد دماغی بتایا ہے وہ درحقیقت یہی خودداری کے احساس کی حد سے بڑھی ہوئی ایک صورت ہے -

یہ خودداری اور بے دماغی میر کی شخصیت میں عجیب عجیب صورتیں اختیار کرتی رہی ہے - ان کی زندگی میں وہ جو ایک چبھن اور خلش کا احساس ہوتا ہے ، وہ بھی اسی کا پیدا کردہ ہے - ان کی زندگی جو ایک المیہ نظر آتی ہے ، اس کی تہ میں بھی اسی کی کارفرمائی ہے - وہ جو زندگی سے بھاگتے پھرتے ہیں اس میں بھی اسی کا ہاتھ دکھائی دیتا ہے - وہ جو ذرا سی بات پر جذباتی ہو جاتے ہیں ، اس میں بھی اسی کے اثرات کا پتہ چلتا ہے - ان کے یہاں چھوٹی چھوٹی باتوں کو مسائل بنا لینے کا جو میلان نظر آتا ہے ، وہ بھی اسی کا نتیجہ ہے - غرض میر کی اس کیفیت نے انہیں عجیب عجیب حالات سے آشنا کیا ہے - بعض اوقات اس سلسلے میں ان کی زود حسی نے زندگی کے بعض معمولات کو ان کے لیے حادثات بنا دیا ہے اور زندگی میں ظہور پذیر ہونے والے عام واقعات ان کے لیے بڑے اہم سانحات کا روپ اختیار کر گئے ہیں -

اسی لیے میر نے اپنی زندگی میں ہمیشہ چھوٹی سے چھوٹی بات کو بڑی سے بڑی بات سمجھا ہے - انہوں نے زندگی میں بے شمار ٹھوکریں کھائی ہیں ، ان کا رد عمل میر کی شخصیت پر ہوا ہے - لیکن جتنا عام حالات میں ہونا چاہیے اس سے کہیں زیادہ ہوا ہے - بلکہ بعض مقامات

پر تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ سیدھی بات کو بھی انھوں نے اُلٹا سمجھ لیا ہے اور اچھے پہلوؤں سے بھی برے پہلو نکالے ہیں ۔ انسان جب اپنی ذات کے بارے میں حد درجہ حساس ہو جاتا ہے تو پھر اس صورتِ حال کا پیدا ہونا یقینی ہوتا ہے ۔

میر کے مزاج کی اسی خصوصیت نے انھیں خاندانی حالات کے ناسازگار ہونے کا کچھ زیادہ ہی احساس دلایا ہے اور وہ اپنی خاندانی زبوں حالی اور پریشانی سے کچھ زیادہ ہی متاثر ہوئے ہیں ۔ جہاں بھی اس کا ذکر انھوں نے کیا ہے ، ڈوب کر کیا ہے ۔ حالانکہ براہ راست اُن پر اپنے آبا و اجداد کی پریشانی کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا ہے ۔ کیونکہ جس وقت یہ اثر ہونا چاہیے تھا ، اس وقت اُن کے والد کی درویشی آڑے آ گئی تھی اور اس نے اس جہان کے بہت سے غم غلط کر دیے تھے ۔ لیکن اس درویشی کی قربت نے میر پر مختلف زاویوں سے کچھ ایسا اثر ڈالا کہ اُن کی دنیا ہی بدل گئی ۔ چنانچہ اس کے بعد میر کی زندگی میں جو کچھ ہوا ہے ، اس کے نقوش اُن کی شخصیت پر بہت گہرے ہیں ۔ اس زمانے میں اُن کا احساس اتنا شدید اور ان کا تاثر اس قدر عمیق ہو جاتا ہے کہ ان کے لیے زندگی ایک الجھن بن جاتی ہے ۔

میر کو اپنی زندگی میں سب سے پہلے جس سانحے سے دوچار ہونا پڑا ہے ، وہ ان کے والد کا انتقال ہے ۔ میر پر اس واقعے کا جتنا اثر ہونا چاہیے تھا ، اس سے کہیں زیادہ گہرا ہوا ہے ۔ کیونکہ اس وقت تک وہ حد درجہ حساس ہو چکے تھے ۔ ویسے یتیمی بہ ذات خود کوئی معمولی بات نہیں ۔ لیکن میر کے لیے اس کی حیثیت ایک بہت بڑے سانحے کی تھی ۔ میر اس کے بعد ہر اعتبار سے بے یارو مددگار رہ گئے اور اس سے زیادہ انھوں نے اپنے آپ کو بے یارو مدگار محسوس بھی کیا ۔ چنانچہ "ذکر میر" میں اس سانحے کو بیان کرکے اپنی ذہنی کیفیت کی تصویر انھوں یوں کھینچی ہے :

"جہاں در چشم من سیاہ گردید ۔ حادثہ عظیمے روداد ۔ آسمان برمن بیفتاد ۔ دریا دریا گریستم۔ لنگر از کف دادم ۔ سر را برسنگ زدم ۔

برخاک افتادم - کل و مکمل بسیار شد ، قیامت پدیدار شد[1] -''

اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ باپ کی موت سے میر کے دل پر ایک کاری زخم لگا جو ساری زندگی مندمل نہ ہو سکا - یہی منبع ہے جہاں سے میر کی زندگی کی ساری الجھنیں اور پریشانیاں شروع ہوئیں - باپ کا سایہ سر سے کیا اٹھا زندگی کا سارا بوجھ ان پر آ پڑا اور ذہنی طور پر وہ اپنے آپ کو یکہ و تنہا محسوس کرنے لگے - اُن کی شخصیت سے جو روحانی فیض انہیں حاصل تھا ، اس کے دروازے بھی بند ہوگئے- دنیا اُن کی نظروں میں واقعی اندھیر ہوگئی اور وہ اس اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے لگے- انہیں کوئی راستہ نظر نہ آیا - چنانچہ ساری زندگی اسی اندھیرے میں بھٹکتے ہوئے گزرگئی اور منزل سے ہم کنار ہونا انہیں نصیب نہ ہوا -

یہ صدمہ بہ ذات خود بھی میر کے لیے کچھ کم نہ تھا - لیکن اس کے نتیجے میں جو حالات پیدا ہوئے اور میر کو جن مصیبتوں سے دوچار ہونا پڑا وہ تو اس صدمے سے کہیں زیادہ صدمات کا پیش خیمہ ثابت ہوئے - میر کے قدم ڈگمگا گئے اور ساری زندگی انہیں سکون میسر نہ آ سکا - بس مارے مارے پھرتے رہے اور زندگی اسی طرح بیت گئی - سوتیلے بھائیوں نے عرصہ حیات تنگ کر دیا - قرض خواہوں کی وجہ سے جان پر آ بنی میر لکھتے ہیں :

''برادر کلانِ من ترک مردم داری گرفت و بے چشم و روئی اختیار نمود - دید کہ پدر آستین کہنہ داشت و بہ بے کسی جامہ گزاشت - قرض خواہاں دامن گیر من خواہند شد - پہلو تہی کرد و گفت کسانے کہ ہم گیر ناز و نعم بودند ، آنہا دانند و کار آنہا - من در حیات پدر دخیل کارے نہ گشتم ، از وقف اولادی ہم گزشتم - سجادہ نشینان او سلامت باشند ، سر را می کنند ، وجہ را می خراشند آنچہ مصلحت وقت خواہد بود ، خواہند نمود - من کہ تازہ بے کس شدہ بودم ، چوں سخنان بے تہ او را شنودم ، غم و غصہ بسیارے خوردم ، التجا بہ او نبردم ، کمر را محکم بستم ، نظر

---

1 - ذکر میر ، ص ۶۰ -

برخدا نشستم[۱] ۔"

غرض میر کو ان حالات سے دوچار ہونے کے بعد بالاخر چھوٹی سی عمر میں معاش کی فکر دامن گیر ہوئی اور اس کے لیے انہیں در در کی خاک چھاننی پڑی ۔ ساری زندگی وہ ہاتھ پاؤں مارتے رہے لیکن کچھ نصیب نہ ہوا ۔ ظاہر ہے ان حالات کے اثرات میر کی شخصیت پر اُداسی اور غم گینی کی صورت میں نمایاں ہونے ہی چاہیے تھے ۔

میر کی زندگی میں یہ صدمات کچھ کم نہ تھے کہ ایک صدمہ انہیں غریب الوطنی کا بھی اٹھانا پڑا ۔ معاش کی تلاش میں وطن کو خیرباد کہنا ان کے لیے خاصا اندوہ ناک تھا ۔ چنانچہ جہاں بھی اس کا ذکر کیا ہے، وہاں ایک ایک لفظ سے حسرت ٹپکتی ہے ۔ ذکر میر ہی میں لکھتے ہیں :

"بہ تلاش روزگار در اطراف شہر استخواں شکستم ، لیکن طرفے نہ بستم ، یعنی چارۂ کار در وطن نہ یافتم ، ناچار بہ غربت شتافتم ۔ رنج راہ برخود ہموار کردم ، شدائد سفر اختیار کردم ، بہ شاہجہان آباد دہلی رسیدم ۔ بسیار گردیدم ، شفیقے نہ دیدم ۔[۲]"

ان حالات میں ظاہر ہے میر کو پریشان ہونا ہی چاہیے تھا ۔ چنانچہ وہ پریشان ہوئے اور یہ پریشانی ساری زندگی ان کے دم کے ساتھ رہی ۔ میر کو اس کا بڑا غم رہا اور بہت سے غموں کے ساتھ اس غم کی آگ بھی انہیں سلگا سلگا کر جلاتی رہی ۔ زندگی بھر اس غم سے انہیں چھٹکارا نہ ملا ۔ کیونکہ غربت انہیں ایک جگہ سے دوسری جگہ اور دوسری جگہ سے تیسری جگہ لیے لیے پھرتی رہی ۔ غرض پاؤں میں چکر ہی رہا ۔

(۵)

پھر سمندِ ناز پر ایک تازیانہ یہ ہوا کہ اس غم روزگار میں غم عشق بھی شامل ہوگیا ۔ اُن کے عشق کا واقعہ بظاہر تو ایک معمولی سا واقعہ

---

۱ ۔ ذکر میر ، ص ۶۰ ، ۶۱

۲ ۔ ذکر میر ، ص ۶۲

تھا ۔ لیکن اس سے جو اثرات انھوں نے قبول کیے ہیں انھوں نے اس کی اہمیت بہت بڑھا دی ہے ۔ میر کے عشق میں دو پہلو خاص طور پر نمایاں ہیں ۔ ایک تو یہ کہ ان کی شخصیت میں عشق کرنے کی پوری صلاحیت تھی ۔ جب سے انھوں نے ہوش سنبھالا ، ان کے یہاں اس کی زمین تیار ہو رہی تھی اور اس کے نتیجے میں انھیں عشق کرنا ہی چاہیے تھا ۔ اس لیے انھوں نے پوری شدت سے عشق کیا ۔ ان کے یہاں عشق کی ایک والہانہ کیفیت ہے ۔ خود میر کو اس پر قابو نہیں رہا ۔ دوسرے یہ کہ انھیں اس عشق میں کامیابی اور کامرانی کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوا ۔ اس لیے عشق ان کے یہاں غم سہنے اور رنج اٹھانے کا مترادف ہوگیا ۔ اس پر رسوائی اور بدنامی مستزاد ہوئی ۔ مخالفتوں کا طوفان اٹھا ۔ ہنگامے ہوئے ۔ ہر شخص نے انھیں مجرم گردانا ۔ اپنے اور بیگانے سب دشمن ہوگئے اور اس عالم میں میر نے اپنے آپ کو تنہا پایا ۔ ان میں حالات سے مقابلے کی سکت نہ رہی ۔ وہ کڑھتے رہے ، ان کی آرزوؤں اور تمناؤں کا خون ہوتا رہا ۔ جذب و شوق پر موت کے سائے ناچتے رہے ۔ جو چاہا وہ نہ ہوا ۔ جو کچھ وہ کرنا چاہتے تھے ، نہ کر سکے ، اور اس صورت حال نے انھیں جلا کر خاک کر دیا ۔ راکھ کا ایک ڈھیر بنا دیااور ان کی شخصیت نے ایک شمع کشتہ کی سی صورت اختیار کر لی ۔

میر کی شخصیت میں جس عشق کی ہنگامہ آرائی نظر آتی ہے اس میں بڑی صداقت ہے ، بڑا خلوص ہے ۔ وہ فطری ہے ۔ اس کو پیدا ہونا ہی چاہیے تھا ۔ کیونکہ جس وقت سے میر نے ہوش سنبھالا اسی وقت سے ان کے کانوں میں یہ باتیں پڑتی رہیں کہ عشق ہی سب کچھ ہے ۔ عشق کے سوا دنیا میں کچھ بھی نہیں ۔ حیات و کائنات کا سارا نظام عشق ہی کے دم قدم سے قائم ہے ۔ ان کے والد میر علی متقی ، جیسا کہ میر نے خود لکھا ہے ۔ اکثر عشق کے بارے میں کچھ اس قسم کی باتیں ان کے کانوں میں ڈالتے رہتے تھے :

"اے پسر ! عشق بورز ۔ عشق است کہ دریں خانہ متصرف است ۔
اگر عشق نمی بود ، نظم کل صورت نمی بست ۔ بے عشق زندگانی

وبال است ۔ دل باختۂ عشق بودن کمال است ۔ عشق بسازد، عشق بسوزد ۔ در عالم ہرچہ ہست ظہور عشق است ۔ آتش سوز عشق است ۔ آب رفتار عشق است ۔ خاک قرار عشق است ۔ باد اضطرار عشق است ۔ موت مستی عشق است ۔ روز بیداری عشق است ۔ مسلم جمال عشق است کافر جلالِ عشق است ۔ صلاح قرب عشق است ۔ گناہ بعد عشق است ۔ بہشت شوق است ۔ دوزخ ذوق عشق است ۔ مقام عشق از عبودیت و عارفیت و زاہدیت و صدیقیت و خلوصیت و مشتاقیت و خلیت و حبیبیت برتراست جمعے برآئند کہ حرکت آسمانہا حرکت عشقی است ۔ یعنی بہ مطلوب نمی رسند و سرگردانند ۔

بے عشق نباید بود ، بے عشق نباید زیست
پیغمبرِ کنعانی عشق پسرے دارد[1]

ظاہر ہے جب ایسی باتیں کانوں میں ہر وقت پڑتی رہیں گی تو ان کا جزو مزاج بن جانا یقینی ہے ۔ چنانچہ میر کے ساتھ ایسا ہی ہوا ۔ عشق کے خیال نے ان کے دل میں گھر کر لیا اور عشق کے بارے میں یہ باتیں ان کی طبیعت کے بنیادی عناصر میں داخل ہوگئیں اور میر غیر شعوری طور پر اس عشق کی تلاش و جستجو میں سرگرداں رہنے لگے ۔ میر نے جو کچھ عشق کے بارے میں سنا تھا ، اس کی نوعیت ، اس میں شک نہیں ، کہ مجازی اور مادی نہیں تھی بلکہ تمام تر حقیقی اور روحانی تھی ۔ لیکن چونکہ میر کو اس کا بھی احساس تھا کہ مجاز حقیقت کی پہلی منزل ہے اس لیے انہوں نے ایک پیکر مجاز میں اپنے آپ کو گم کر دیا اور ساری زندگی اسی میں گم رہے ۔ انہوں نے اس سے زیادہ اس کے خیال سے عشق کیا اور اس صورت حال کے ہاتھوں وہ عجیب و غریب حالات سے دوچار ہوئے ۔ بہرحال اس عشق کی صداقت سے انکار ممکن نہیں ۔

اس عشق نے میر کی شخصیت میں بعض معیاروں کے احساس کو بیدار کیا ہے ۔ کچھ اصولوں کی اہمیت واضح کی ہے اور اس میں شک

---

۱ ۔ ذکر میر : صفحہ ۲

نہیں کہ میر نے ساری زندگی ان اصولوں اور معیاروں کا خیال رکھا ہے۔
اس عشق کا اپنا ایک نظام ہے اور میر اس نظام عشق کے بہت بڑے علم بردار
ہیں ۔ اُن کی شخصیت میں صداقت اور خلوص ، پاکیزگی اور سپردگی ،
ایثار اور قربانی ، درد اور خستگی کے جو عناصر ہیں ، ان کو اسی نظام
عشق نے پیدا کیا ہے ۔ میر کی شخصیت میں یہ پہلو سب سے زیادہ نمایاں
ہیں اور وہ انھی پہلوؤں سے پہچانے جاتے ہیں ۔

(٦)

میر کی شخصیت میں جذبہ عقل پر غالب ہے ۔ اس کا ایک سبب
ان کی طبیعت کا یہ عشقیہ میلان بھی ہے ۔ لیکن اس کی بنیادی وجہ ان
کی اُفتاد زندگی ہے ۔ میر کو ابتدا ہی سے ایسا ماحول ملا جس میں عقل
سے کہیں زیادہ جذبے کی حکمرانی تھی ۔ شعور سے کہیں زیادہ وجدان
کا سکہ چلتا تھا ۔ پھر اس کے ساتھ ایک بات یہ بھی ہے کہ میر کی
تربیت تو ہوئی لیکن عرف عام میں جس کو تعلیم سے تعبیر کیا جاتا ہے
اس کے مواقع انھیں بہت کم ملے ۔ اس میں شک نہیں کہ اپنے والد
میر علی متقی اور اپنے منہ بولے چچا سید امان اللہ سے انھوں نے بہت
کچھ حاصل کیا ۔ لیکن میر بہ مشکل سن شعور کو پہنچے تھے کہ ایک
ہی سال میں صرف دس مہینے کے وقفے سے دونوں انتقال کر گئے اور اس
کے بعد میر کی زندگی میں سخت افراتفری اور انتشار کا دور شروع ہوا ۔
اس عالم میں تعلیم کی طرف باقاعدہ توجہ ناممکن تھی ۔ ویسے دلی کے
دوران قیام میں انھوں نے تعلیم کی طرف اپنا میلان ضرور ظاہر کیا اور
حتی الامکان اس بات کی کوشش بھی کی کہ تعلیم کا سلسلہ کسی نہ کسی
طرح جاری رہے ۔ چنانچہ اس عسرت اور پریشانی کے عالم میں بھی
اس خیال کا دامن ان کے ہاتھ سے نہ چھوٹا ۔ میر جعفر عظیم آبادی
سے اُن کی ملاقات اور تعلیم حاصل کرنے کے بارے میں گفتگو اس
حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ انھیں اس کا شوق ضرور تھا ۔ وہ اس شمع
کے پروانے ضرور تھے ۔ اگرچہ اس زمانے میں ان پر مفلسی اور بیکاری
مسلط تھی ۔ لیکن انھوں نے میر جعفر کی شرط مان کر تعلیم حاصل کرنے

کا سلسلہ شروع کر دیا ۔ خود لکھا ہے :

''روزے بر سرِ بازار ، جزو کتابے در دست نشستہ بودم ، جوانے میر جعفر نام ازاں راہ گزشت نظرش بر من افتاد و تشریف داد ۔ بعد از ساعتے گفت کہ اے عزیز ، دریافتہ می شود کہ ذوق خواندن داری ، من ہم کشتۂ کتابم ۔ اما مخاطبے نمی یابم ۔ اگر شوق در رشتہ باشی ، چندے رسیدہ باشم ۔ گفتم ، دستے نہ دارم کہ خدمتے از من بیاید ، اگر للہ ایں رنج بر خود گوارا کنی ، عین بندہ نوازی است ۔ گفتار ایں قدر ہست کہ تہ پاتا نہ باشد ، پا بیرون نمی گزارم ۔ گفتم خدائے کریم آساں خواہد کرد ۔ اگرچہ من ہم چیزے نہ دارم ۔ پا درمیہائے آں نسخہ درہم را مطابق سر صفحہہائے آیندہ کردہ داد و رفت ۔ ازاں روز اکثر ملاقات آں ملک سیرت و آدم صورت اتفاق می افتاد و بہ لطف نہاتیم زباں می داد ، یعنی دماغِ خودے سوخت و مرا چیزے می آموخت ۔ تا مقدور من نیز بالش نرم زیرِ سر او می گزاشتم ، یعنی صرف او بود ، آنچہ میسر می داشتم[1] ۔''

لیکن ظاہر ہے اس تعلیم میں بھی کوئی باقاعدگی نہیں تھی ۔ البتہ اس واقعے سے میر کا میلان تعلیم کی طرف ضرور نظر آتا ہے اور یہ میلان ساری زندگی ان کے ساتھ رہا ہے لیکن زمانے نے انھیں اتنی فرصت نہیں دی ہے کہ وہ اس کو تکمیل تک پہنچا سکیں ۔ ویسے انھوں نے فارسی اور عربی پڑھی ۔ ان زبانوں میں ان کو دست گاہ بھی تھی ۔ کتابوں کے وہ شوقین بھی تھے ۔ خان آرزو کی صحبت سے بھی انھیں بہت کچھ حاصل ہوا ہو لیکن جو کچھ وہ چاہتے تھے وہ انھیں اس سلسلے میں حاصل نہ ہو سکا ۔ میر علی متقی اور امان اللہ جلد ہی مر گئے ۔ میر جعفر ملنے کے کچھ ہی عرصے بعد اپنے وطن عظیم آباد چلے گئے اور خان آرزو نے بہت جلد میر سے بیر باندھ لیا ۔ غرض اس معاملے میں بھی میر کو ایک ناکامی ہی سے دوچار ہونا پڑا اور اس کی حسرت بھی ان کے دل میں داغ بن کر رہ گئی ۔

---

[1] ذکر میر ، ص ٦٦

البتہ علم اور تعلیم کی طرف ان کی طبیعت کا میلان ہمیشہ رہا اور اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ انھوں نے اس سلسلے میں بہت کچھ حاصل بھی کر لیا ۔ فارسی زبان پر انھیں خاص طور پر قدرت حاصل ہوگئی ۔ امیرالامرا صمصام‌الدولہ سے ملاقات کے وقت برجستہ طور پر ان کے مدارالمہام کی زبان کی غلطی کی طرف اشارہ کرنا اس حقیقت کو واضح کرتا ہے ۔ میر نے کتنی بے باکی سے اس واقعے کو لکھا ہے :

''التماسے کہ نوشتہ بودم از کیسہ برآوردم ۔ ناگاہ از زبان خواجہ مذکور برآمد کہ وقت قلم دان نیست ۔ چوں ایں سخن شنیدم بہ قاہ قاہ خندیدم ۔ نواب در روئے من دیدہ سبب خندہ پرسید ۔ عرض نمودم کہ ایں عبارت را نہ فہمیدم ۔ اگر ایشاں می گفتند ، قلم دان بردار حاضر نیست ۔ ایں حرف گنجائش داشت یا وقت دستخط نواب نیست باقی بود ۔ وقت قلم دان نیست ، انشائے تازہ است قلم دان چوبِ پیش نمی باشد ۔ وقت در غیر وقت نمی داند ۔ بہ ہر نفرے کہ اشارت رود بر داشتہ بیارد ۔ نواب بہ خندہ درآمد و گفت کہ معقول می گوید ۔''[1]

یہ واقعہ میر کے لسانی شعور پر دلالت کرتا ہے ۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ وہ اتنی چھوٹی عمر میں بھی زبان کے مزاج کو سمجھتے تھے ۔ اس کے روزمرہ اور محاورے کا انھیں صحیح علم تھا اور یہ بات کاوش اور محنت ہی سے پیدا ہو سکتی ہے ۔ میر نے زبان کے سلسلے میں یہ محنت کی ہے لیکن شاید اس کی وجہ ان کا شاعرانہ مزاج ہے ۔ شاعری زبان کے شعور کا تقاضا کرتی ہے میر کے یہاں یہ شعور اسی وجہ سے پیدا ہوا ہے ۔

اور میر کی شاعرانہ مزاجی سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا ۔ تصوف سے قربت نے ان کی شخصیت میں اس پہلو کو ابھارا اور وہ وقت کے ساتھ ساتھ اس سے قریب ہوتے گئے ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چھوٹی عمر ہی میں ان کی شاعرانہ حیثیت تسلیم کر لی گئی ۔ انھوں نے خود

---

۱ ۔ ذکرِ میر ، ص ۶۲ ، ۶۳

اس کا اظہار کیا ہے ۔ لکھتے ہیں :

"بعد از چندے با سعادت علی نام ، سیدے کہ از امروہہ بود ، برخوردم ۔ آن عزیز مرا تکلیف موزوں کردن ریختہ کہ شعرے است بہ طورِ شعرِ فارسی ، بہ زبان اردوئے معلّی بادشاہِ ہندوستان و در آں وقت رواج داشت ، کرد ۔ خودکشی جہد بلیغ کردم و مشق خود بہ مرتبہ رساندم کہ موزونانِ شہر را مستند شدم ۔ شعر من در تمام شہر دوید و بہ گوش خرد و بزرگ رسید ۔"[1]

اس بیان سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ میر نے بہت جلد اس فن میں کمال حاصل کر لیا تھا اور ان کی شاعرانہ شہرت دور دور تک پھیل گئی تھی ۔ اس میں یقیناً خان آرزو کے فیضِ صحبت کو بھی دخل ہوگا ۔ بہرحال مطلب یہ ہے کہ میر بنیادی طور پر ایک شاعرانہ مزاج رکھتے تھے ۔ اس کی تکمیل کے انہیں مواقع بھی ملے ۔ البتہ دوسرے علوم سے انہیں لگاؤ نسبتاً کم رہا ۔ اس لیے وہ زندگی کے ہر دور میں عقل سے زیادہ جذبے کی طرف جھکتے گئے ۔

میر کی شخصیت میں جذبے کی طرف جھکاؤ بہت نمایاں نظر آتا ہے ۔ جیسا کہ پہلے کہا گیا ، اس کا ایک سبب تو تعلیم کی بے قاعدگی ہے ۔ دوسرے ان کی زندگی کا عشقیہ پہلو ہے اور تیسرے ان کا شاعرانہ مزاج ہے ۔ ان تینوں نے مل کر میر کو عقل کے مقابلے میں جذبے سے نسبتاً زیادہ قریب کیا ہے—اور یہ صورتِ حال ان کی زندگی میں برابر نئے نئے گل کھلاتی رہی ہے ۔

(۷)

وہ زمانہ جس میں میر کی شخصیت کی نشو و نما ہوئی ہے ، بڑے انتشار کا زمانہ ہے ۔ اس انتشار میں سیاسی ہنگامے ، معاشی ، معاشرتی افراتفری ، تہذیبی و ثقافتی ابتری سب ہی کچھ شامل ہے ۔ ان سب نے مل کر مجموعی طور پر میر کی شخصیت پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں ۔ ان کی زندگی میں اندر تو اندھیرا تھا ہی ، ان حالات نے اس کے باہر بھی

۱- ذکر میر ، ص ۶۲ ، ۶۳

اندھیرا کر دیا ہے ۔ چنانچہ میر اس اندھیرے میں ہی سرگرداں رہتے ہیں ۔ انھوں نے سلطنتوں کو ختم ہوتے ، بادشاہوں کی آبرو کو مٹی میں ملتے ، شریفوں اور نجیبوں کو در بدر کی خاک چھانتے ، عوام کو روٹی کے لیے ترستے دیکھا ہے ۔ ان کی آنکھوں کے سامنے شہر لٹ گئے ہیں ، آبادیاں ویران ہوگئی ہیں ۔ ہزاروں بے گناہوں کے خون سے ہولیاں کھیلی گئی ہیں ۔ لاکھوں انسانوں کو خانماں برباد ہونا پڑا ہے اور اس طرح زندگی پر موت رقص کرتی رہی ہے ۔ ان حالات نے میر کا جی سرد کر دیا جینے سے وہ بیزار ہوگئے اور ایک قلزم خوں ان کے اندر موجیں مارنے لگا ۔ انھیں خود موت نہیں آئی ۔ لیکن ان حالات نے ان کی زندگی کو موت میں تبدیل کر دیا ۔

ان حالات نے سب سے زیادہ میر کی جذباتی زندگی کو ٹھیس لگائی ۔ اس کی بنیادیں ہل گئیں ۔ شہروں کا لٹنا ، بستیوں کا ویران ہونا ، سلطنتوں کا مٹنا اور شاہوں کے تاج و تخت کا خاک میں ملنا بہ ذات خود اتنا متاثر کرنے والا نہیں تھا جتنا کہ یہ خیال کہ ان کے ساتھ بیسوں جذباتی پہلو تھے جو فنا کی نیند سوگئے ۔ میر کو ان سب کے ساتھ لگاؤ تھا ۔ یہ ساری تباہی میر کی ذاتی تباہی کے ساتھ ساتھ ان کے وطن کی تباہی بھی تھی ۔ اس زمانے کے علوم فنون کی تباہی بھی تھی ۔ اسی لیے میر نے اس صورت حال پر خون کے آنسو بہائے ہیں ۔ 'ذکر میر' میں انھوں نے جذبے کی کس شدت کے ساتھ اس کیفیت کو بیان کیا ہے ۔ جس سے دلی کو درانیوں کے حملے کے بعد دوچار ہونا پڑا ، لکھا ہے :

"روزے پرست زوم ۔ راہم بر ویرانۂ تازۂ شہر اُفتاد ۔ بر ہر قدمے گریستم و عبرت گرفتم و چوں بیش تر رفتم ، حیراں تر شدم ، مکان ہارانہ شناختم ، دیارے نہ یافتم ۔ از عمارت آثار نہ دیدم ۔ از ساکنان خبر نہ شنیدم ۔"

از ہر کہ سخن کردم گفتند کہ ایں جانیست
از ہر کہ نشاں جستم ، گفتند کہ پیدا نیست

---

۱ ۔ ذکر میر ، صفحہ ۹۹

خانہہا نشستہ ، دیوار ہا شکستہ ، خانقاہ بے صوفی، خرابات بے مست خرابہ بود ، ازیں دست تا بہ آں دست :

ہر کجا افتادہ دیدم خشت در ویرانہ
بود فردِ دفترِ احوالِ صاحب خانہ

بازار ہا کجا کہ بہ گویم ، طفلاں تہ بازار کجا ، حسن کو کہ بہ ہرسم ، یاران زرد رخسار کو، جوانان رعنا رفتند، پیران پارسا گزشتند ، محل ہا خراب ، کوچہ ہا نایاب ، وحشت ہویدا ، آنس ناپیدا ، رباعی اُستادے بیادم آمد :

افتاد گزارم چو بہ ویرانہ طوس
دیدم چغدے نشستہ برجائے خروس

گفتم چہ خبر داری ازیں ویرانہ ؟
گفتاخبر ایں است کہ افسوس! افسوس![1]

اس عبارت کے ایک ایک فقرے سے یہ حقیقت ٹپکتی ہے کہ اس تباہی پر میر کو جو غم ہوا وہ محض انفرادی نہیں تھا ۔ اس کی نوعیت اجتماعی ، معاشرتی اور تہذیبی بھی تھی ۔ اُن کی نگاہیں اس ایک ایک چیز کو دیکھتی تھیں جس کو اس ہنگامے نے اپنی جگہ سے ہٹا دیا تھا ۔ مکان مٹ جاتے تو صبر تھا ، عمارتیں ختم ہو جاتیں تو ایسی کوئی بات نہیں تھی ۔ میر کو غم تو اس بات کا تھا کہ بازاروں کا وجود ہی باقی نہ رہا ۔ اُن کی رونقیں ختم ہوگئیں ۔ گلی کوچے مٹ گئے ۔ ان کی چہل پہل باقی نہ رہی ۔ بچے جس طرح ان گلیوں میں کھیلتے پھرتے تھے وہ انداز ختم ہوگیا ۔ خانقاہیں اُجڑ گئیں ۔ صوفیوں اور درویشوں کا وہ ماحول نہ رہا ۔ غرض میر کو غم یہ ہے کہ اس تباہی کے ساتھ ان کے پورے ماحول کی عمارت زمین پر آ رہی ۔

یہ ٹھیک ہے کہ ان حالات کی وجہ سے انفرادی طور پر جو غم انہیں اٹھانا پڑا اور ذاتی طور پر جذبات کا جو خون ہوا اس کا اثر ان پر بہت

---

۱ ۔ ذکر میر ، ص ۹۹

زیادہ ہے ۔ کیونکہ ان کی وجہ سے وہ تمام دلچسپیاں ختم ہوگئیں جو اُن کی زندگی میں تھیں ۔ اُن تمام چیزوں کا جنازہ نکل گیا جن سے میر کی زندگی میں رنگ تھا ۔ اس تباہی کو بیان کرتے ہوئے اپنی ذاتی اور انفرادی تباہی کی تفصیل میر نے کس قدر ڈوب کر پیش کی ہے ۔ لکھتے ہیں :

''ناگاہ در محلہ رسیدم کہ آں جامی ماندم ، صحبت می داشتم ، شعر می خواندم ، عاشقانہ می زیستم ، شب ہاے گریستم ، عشق باخوش قداں می باختم ۔ ایشاں را بلندے انداختم ، یا سلسلۂ مویاں می بودم ، پرستش نکویاں می نمودم ۔ اگر دمے بے ایشاں می نشستم ، تمنا بر تمنا می شکستم ، بزم می آراستم ، خوباں را می خواستم ۔ مہمانی می کردم ۔ زندگانی می کردم ۔ دوست روئے نیامد کہ بار نفس خوش بر آرم ۔ مخاطب صحیحے نہ یافتم کہ صحبت دارم ۔ بازار وحشت کاہی ، کوچہ بہ صحرا راہی ۔ ایستادم و بہ حیرت دیدم ۔ مکروہ بسیارے کشیدم ۔ عہد کردم کہ باز نیایم ۔ تاباشم قصدِ شہر نہ نمایم[1] ۔''

جب وہ جگہ ہی نہ رہے جہاں انسان نے زندگی بسر کی ہو تو اس کا جتنا بھی غم کھایا جائے کم ہے ۔ دیکھنے کی بات یہاں یہ ہے کہ میر کو کسی مادی چیز کا غم نہیں ہے ، غم ان صحبتوں کا ہے جو انہیں میسر تھیں ۔ غم اس ساری زندگی کا ہے جو ایک مخصوص سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی ۔ غم ان قدروں کا ہے جنھیں وہ عزیز رکھتے تھے ۔ ظاہر ہے اس کی نوعیت مادی نہیں بلکہ روحانی اور جذباتی ہے ۔ میر پر ساری زندگی اس کا اثر رہا ہے ، اور وہ ایک لمحے کو بھی اس غم سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکے ہیں ۔ یہ غم ان کے مزاج میں داخل ہوگیا ہے ۔ اُن کی طبعیت کا جز بن گیا ہے اور وہ اس شدت غم کی وجہ سے بجھ کر رہ گئے ہیں ۔

میر کی شخصیت میں جو اُداسی اور سوگواری ہے ، اس میں یہ صورت حال بھی برابر کی شریک ہے ۔

---

۱ ۔ ذکر میر صفحہ ۱۰۰

(۸)

یہ ایک حقیقت ہے کہ میر بنیادی طور پر درویش منش تھے ۔ ان کی زندگی میں ایک رندانہ آن اور ایک قلندرانہ شان تھی ۔ وہ اپنے حال میں مست تھے ۔ لیکن اس کے باوجود حالات نے انھیں امراء و رؤسا کے درباروں میں جانے کے لیے مجبور کیا ہے ۔ طوعًا و کرہًا وہ ان درباروں میں گئے بھی ہیں ۔ لیکن انھوں نے اس درباری ماحول سے مطابقت پیدا نہیں کی ہے ۔ انھوں نے ان درباروں کے مذمومات کو محسوس کیا ہے ۔ اسی لیے وہ درباروں میں رہتے ہوئے بھی درباری ہو نہیں ہو سکے ہیں ۔ انھیں دربار داری آئی نہیں ہے ۔ انھوں نے امیر الامراء صمصام الدولہ، نواب بہادر ، مہا نرائن دیوان وزیر ، راجہ جگل کشور ، راجہ ناگرمل اور آصف خان کی ملازمتیں کی ہیں ۔ اس لیے اس زمانے کے رئیسوں اور درباروں کو انھیں بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے ۔ لیکن ان امیروں کے قریب رہ کر بھی ان کی انفرادیت برقرار رہی ہے ۔ انھوں نے ان درباروں کے تعیش سے کوئی سروکار نہیں رکھا ہے ۔ ان کی مبالغہ آرائیوں سے انھیں کوئی نسبت نہیں رہی ہے ۔ ان کی لایعنی باتوں سے انھیں کوئی تعلق نہیں رہا ہے ۔ برخلاف اس کے میر نے وہاں رہ کر اس نظام کے کھوکھلے پن کو محسوس کیا ہے اور اس زمانے کے نظام اقدار میں جو تضاد تھا ، اس پر ان کی نظر رہی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ میر کے یہاں بنیادی انسانی قدروں کی پاسداری کا خیال ہمیشہ نمایاں رہا ہے ۔ انھوں نے انسان کی اہمیت ، اس کی عظمت اور برتری کے خیال کو ہمیشہ اپنے پیش نظر رکھا ہے ۔ اسی لیے ان کی شخصیت میں انسان اور انسانیت کے آہنگ کی آواز برابر سنائی دیتی ہے—اور اسی صورت حال نے ان کے یہاں وہ گداز پیدا کیا ہے ، انسانی زندگی کے ساتھ جس کی حیثیت لازم و ملزوم کی ہے ۔

انسان اور انسانیت کے خیال اور بنیادی انسانی قدروں کے احساس نے میر کو اس زبوں حالی کا احساس دلایا ہے جس کی وجہ سے انسان نے ہر دور میں ذلتیں اٹھائی ہیں ۔ اپنے آپ کو بدنام اور رسوا کیا ہے ۔ میر کو اس کا بھی بڑا غم ہے ۔ انھوں نے اس پر بھی خون کے آنسو بہائے ہیں

اور اُن کی شخصیت کے کسی نہ کسی گوشے میں اس بات کا غم بھی کہیں نہ کہیں چھپا ہوا نظر آتا ہے ۔ میر کی شخصیت میں اس غم کی بھی بڑی چبھن ہے ۔ اس چبھن نے انہیں بڑی حد تک تخیلی اور رومانی بھی بنا دیا ہے کیونکہ اس مزاج کے لوگوں کا تخیلی اور رومانی ہو جانا ، ایسی کوئی عجیب بات نہیں ۔

خیر ، تو قصہ مختصر یہ کہ میر اس شخصیت کے مالک تھے ۔ اس شخصیت کا انسان دنیا کے کام کا نہیں رہتا ۔ زندگی اس کے لیے اور وہ خود زندگی کے لیے بوجھ بن جاتا ہے ۔ وہ رو رو کر زیست کرتا ہے ۔ بلکہ رونا ہی اس کی زندگی بن جاتا ہے ۔ وہ گریہ و زاری کے سہارے جیتا ہے ۔ رنج والم اس کے رفیق بن جاتے ہیں ۔ ایسے شخص کو مسرت کا منہ دیکھنا نصیب نہیں ہوتا ۔ بلکہ مسرت میں بھی اسے غم کی صورت نظر آتی ہے ۔ اسی لیے مسرت سے اُسے کوئی سروکار نہیں رہتا ۔ زندگی کے نشاطیہ پہلو ، اس کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں رکھتے ۔ وہ زندگی کے لیے اجنبی اور انجان ہوتا ہے اور زندگی خود اس کے لیے اجنبی اور انجان بن جاتی ہے ۔ ایک ایسی شخصیت رکھنے والے انسان کی زندگی تلخیوں میں گزرتی ہے ۔ دنیا میں اس کے لیے کوئی ٹھکانا نہیں ہوتا ۔ اسے اگر کہیں پناہ ملتی ہے تو تخلیق کی دنیا میں ۔ فن اس کا سب سے بڑا مونس و دمساز ہوتا ہے ۔ اس کے سہارے زندگی کی تلخیاں اس کے لیے گوارا ہو جاتی ہیں ۔ وہ اپنی ایک دنیا بنا لیتا ہے اور اس دنیا میں اُسے زندگی بسر کرنے کے آداب آ جاتے ہیں ۔

میر کو بھی یہی صورت حال پیش آئی ہے ۔ اُن کی شخصیت کے ان تمام پہلوؤں نے مل کر انہیں شعر و شاعری اور ادب کی طرف راغب کیا ہے اور شاعر بنا دیا ہے ۔ شاعری ان کے لیے ایک جائے پناہ بن گئی ہے ۔ اس لیے اول و آخر وہ ایک شاعر ہی رہے ہیں اور شاعر ہونا ہی اُن پر پھبتا ہے اور انہیں زیب دیتا ہے ۔ اس کے سوا وہ اور کچھ ہو ہی نہیں سکتے تھے ۔ انہوں نے زندگی میں شعر و شاعری اور ادب کا سہارا لیا ہے اور وہ خود شعر و ادب کے لیے ایک سہارا بن گئے ہیں ۔

اور شاید یہی اُن کی شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو ہے !

۵

میر کی تصانیف

میر نے ساری زندگی ادب اور شعر و شاعری کی دنیا میں بسر کی ہے - وہ اسی کے سہارے جیتے ہیں - انھوں نے شعر کہے ہیں - شاعری کی ہے - ان کی زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ یہی ہے - وہ خود اپنے آپ کو شاعر نہیں کہتے - ان کے خیال میں تو جو دیوان انھوں نے بنایا ہے ، وہ تو محض درد و غم کا ایک مجموعہ ہے - اس دیوان میں سے خود بہ قول میر جہاں سے دیکھیے ایک شعر شور انگیز نکلتا ہے اور اسی لیے اس میں قیامت کا سا ہنگامہ نظر آتا ہے - اس میں شک نہیں کہ میر کے دیوان میں ہنگامہ ہے لیکن اس میں بھی شبہ نہیں کہ اس نے ہنگامہ برپا بھی کیا ہے اور یہ دیوان ایک نہیں ہے ، تعداد میں چھ عدد ہیں جن میں سے ہر ایک خود بہ قول میر جادو کی پڑی کی حیثیت رکھتا ہے - شہروں شہروں اور ملکوں ملکوں ان کی شہرت ہے اور گھر گھر ان کا چرچا ہے -

(۲)

یہ دیوان غزلیات پر مشتمل ہیں ۔ ان میں بہت بڑی تعداد میں غزلیں ہیں ۔ جن کو بہ ترتیب حروف تہجی جمع کیا گیا ہے ۔ ان غزلوں کی تاریخی ترتیب کا تو علم نہیں ۔ کیونکہ میر نے اس کا کہیں ذکر نہیں کیا ۔ البتہ قیاس یہ کہتا ہے کہ جیسے جیسے غزلیں ہوتی گئی ہیں ، ان کو بہ ترتیب حروف تہجی جمع کیا جاتا رہا ہے ۔ ورنہ تمام دیوانوں میں علیحدہ علیحدہ حروف تہجی کی ترتیب نہ ہوتی ۔ بلکہ ان چھ دیوانوں کی جگہ ایک مکمل دیوان کو ترتیب دیا جاتا اور اس طرح مختلف دیوانوں کی غزلیں حروف تہجی کے اعتبار سے یک جا ہو جاتیں ۔ چھ دیوانوں کو الگ الگ جمع کرنے میں بہ ظاہر کوئی مصلحت نظر نہیں آتی ۔ سوائے اس کے کہ یہ مختلف ادوار میں جمع کیے گئے ہیں اور آخر میں ان سب کو یکجا کرکے ایک مکمل شکل دے دی گئی ہے ۔ ان میں غزلوں کی تعداد چونکہ بہت زیادہ ہے اس لیے یہ محسوس ہوتا ہے کہ میر نے جتنی غزلیں کہی ہیں ، وہ سب کی سب ان میں موجود ہیں ۔ ان کا کلام ضائع نہیں ہوا ہے ۔ اسی لیے ان دیوانوں میں اچھی غزلیں بھی ہیں اور بری بھی ۔ بلند بھی ہیں اور پست بھی !

لیکن ان غزلوں میں میر کو سمجھنے کا بڑا سامان ہے !

غزلوں کے علاوہ میر نے قصیدے بھی کہے ہیں ۔ لیکن وہ تعداد میں بہت کم ہیں اور ان میں قصیدوں کا سا انداز بھی نہیں ہے ۔ قصیدوں کی جو فنی خصوصیات ہوتی ہیں ، ان سے یہ قصیدے محروم ہیں ۔ بات یہ ہے کہ میر کو قصیدے سے کوئی ذہنی لگاؤ نہیں تھا ۔ اسی لیے انھوں نے اس صنف میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لی ہے ۔ بس چند قصیدے کہہ لیے ہیں اور ان میں بھی وہ اہتمام ملحوظ نہیں رکھا ہے جو قصیدہ نگاری کے لیے ضروری ہوتا ہے ۔ اسی لیے قصیدوں کی حیثیت سے ان کی کوئی خاص اہمیت نہیں سوائے اس کے ان میں سے اکثر بزرگان دین کے بارے میں ہیں ۔

البتہ میر نے جو مثنویاں لکھی ہیں ۔ ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ۔ ہرچند کہ ان مثنویوں میں بھی مثنوی کے فن کی بنیادی

خصوصیات نہیں ہیں ۔ لیکن اس کے باوجود ان کی اہمیت مسلم ہے ۔ کیونکہ یہ مثنویاں شمالی ہندوستان میں مثنوی نگاری کی اولین کامیاب کوشش ہیں ۔ میر کی عشقیہ مثنویوں میں خواب و خیال ، شعلہ عشق ، دریائے عشق ، اعجاز عشق ، معاملات عشق اور ساقی نامہ قابل ذکر ہیں ۔ ان مثنویوں میں کہانی کا عنصر بھی موجود ہے اور ساتھ ہی وہ تغزل بھی ہے جو میر کے ساتھ مخصوص ہے ۔ ان کے علاوہ میر نے مختلف موضوعات پر کچھ اور مثنویاں بھی لکھی ہیں ، جن میں مثنوی مذمت دنیا ، نسنگ نامہ ، اژدر نامہ ، مذمت برشکال ، ہجو خانۂ خود ، کذب ، شکار نامہ ، مرغ بازاں ، ہولی ، سگ و گربہ وغیرہ خاص طور پر اہم ہیں ۔ یہ مثنویاں اپنے موضوعات کے تنوع اور انداز بیان کی سادگی اور بے ساختگی کی وجہ سے مثنوی نگاری کی صنف میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں ۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ مثنوی کی شکل میں یہ شاعرانہ اعتبار سے نہایت خوبصورت نظمیں ہیں ۔

مثنویوں کے ساتھ ساتھ میر کے کلیات میں مخمس ، مسدس ، ترکیب بند اور ترجیع بند بھی ملتے ہیں ۔ ان میں سے بیشتر میں انہوں نے اپنے معتقدات کا بیان کیا ہے ۔ ایک ہفت بند ، ایک ترجیع بند ، دس مخمس ، تین مسدس منقبت میں کہے ہیں ۔ ایک مسدس کا موضوع نعت ہے ۔ تین مخمس ایسے ہیں جن میں دوسرے شعرا کی غزلوں کی تضمین کی گئی ہے ۔ چند مثلث میں تضمینیں ہیں ۔ ان کے علاوہ چار مخمس میں ہجویات ہیں اور دو ترکیب بند عاشقانہ ہیں ۔

اُردو میں میر نے اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا ۔ ان تمام اصناف یعنی غزل ، قصیدہ ، مثنوی رباعی ، ترکیب بند ، ترجیع بند ، مخمس ، مسدس سب کو یک جا کیا جائے تو میر کا کلیات بنتا ہے ، جو اُردو میں ایک اہم شعری مجموعے کی حیثیت رکھتا ہے ۔

کلیات کے علاوہ میر کے مراثی کا ایک مجموعہ بھی ہے ، جس کا ایک نسخہ پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب مرحوم کے کتب خانے میں موجود ہے ۔ ان مراثی کو مسیح الزماں صاحب نے مرتب

کرکے الہ آباد سے شائع کر دیا ہے۔ اور یہ مرثیے میرے مرتب کیے ہوئے کلیات میر میں بھی شامل ہیں۔

میر نے اردو کے ساتھ ساتھ فارسی میں بھی شاعری کی ہے اور ایک دیوان فارسی بھی مرتب کیا ہے۔ مصحفی نے لکھا ہے :

"دعوئے شعر فارسی چنداں نہ وارد۔ اگرچہ فارسی کم از ریختہ نمی گوید۔ می گفت کہ دو سال شغل ریختہ موقوف کردہ بودم۔ دراں ایام قریب دو ہزار بیت فارسی صورت تدوین یافتہ[1]۔"

میر کا فارسی دیوان مطبوعہ نہیں ہے۔ ویسے اس کے کئی قلمی نسخے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں۔ ایک قلمی نسخہ پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب مرحوم کے کتب خانے میں ہیں۔ یہ نسخہ دوسو صفحات پر مشتمل ہے۔ دوسرا نادر نسخہ ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کے کتب خانے میں ہے۔ یہ نسخہ ۱۱۹۲ھ کا لکھا ہوا ہے۔ اس کا لکھنے والا دولت رائے کاتب ہے اور اس میں کل ۸۸ صفحات ہیں۔ ایک اور اہم نسخہ کتب خانۂ آصفیہ میں ہے۔ اس کی کتابت ۱۲۱۴ھ کی ہے اور اللہ رکھا نامی کاتب نے اس کو لکھا ہے۔ اس کے علاوہ فارسی دیوان کا ایک نسخہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں بھی ہے۔ میر کے فارسی کلام پر سب سے پہلے حضرت عزیز لکھنوی نے ایک مبسوط مقالہ رسالہ نیرنگ رام پور کے میر نمبر میں لکھا۔ پھر اس کے بعد ایک مقالہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صاحب نے رسالہ مصنف میں شائع کیا۔ لندن کے دوران قیام میں برٹش میوزیم میں بھی کلیات میر کا نسخہ آشفتہ میری نظر سے گزرا ہے — جس میں میر کا فارسی دیوان موجود ہے۔ میر کے فارسی دیوان کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ فارسی پر انھیں قدرت حاصل ہے۔ اور اس زبان میں بھی انھوں نے اعلیٰ درجے کی غزلیں کہی ہیں۔

(۳)

شعرائے اردو کا ایک تذکرہ بھی میر نے لکھا ہے۔ جو "نکات الشعرا" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ اردو شعرا کے اولین تذکروں میں

۱۔ مصحفی : عقد ثریا صفحہ ۵۴

سے ہے - ''اس وقت تک جتنے تذکرے دستیاب ہوئے ہیں ، ان میں نکات الشعرا کو تقدم حاصل ہے - میر کے علاوہ بعض اور تذکرہ نویس بھی اس بات کے مدعی ہیں کہ سب سے پہلے ریختہ گو شعرا کا تذکرہ انہوں نے لکھا ہے - مثلاً قائم جس کے تذکرے کا سن تالیف ۱۱۶۸ھ ہے یا خاکسار ، جس نے ۱۱۱۵ھ میں ''معشوق چہل سالہ خود'' کے نام سے ایک تذکرہ لکھا - گارساں دی‌تاسی نے غلطی سے یہ خیال کر لیا ہے کہ گردیزی کو بھی یہ دعویٰ ہے کہ اس کا تذکرہ سب سے پہلا ہے - حالانکہ اس نے کہیں ایسا دعویٰ نہیں کیا اور اپنے دیباچے میں ان تذکروں کی ناانصافی اور کم تحقیقی کی شکایت کی ہے ، جو اس سے قبل لکھے گئے ہیں - یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اس نے اپنا تذکرہ میر ہی کے جواب میں لکھا ہے - خاکسار کے تذکرے کے متعلق میر فرماتے ہیں کہ ''علی الرغم ایں تذکرہ نوشتہ است بنام معشوق چہل سالۂ خود - احوال خود را اول از ہمہ نگاشتہ و خطاب خود سید الشعرا پیش خود قرارداده'' اس کی حقیقت ان چند سطروں سے ظاہر ہے - تذکرہ گردیزی کا سنہ تالیف ۱۱۶۶ھ اور قائم کا ۱۱۶۸ھ ہے— ''میر نے اپنے تذکرے کے سن تالیف کے متعلق کہیں کوئی صراحت نہیں کی - البتہ انند رام مخلص کے حال میں یہ فقرہ ان کے قلم سے ایسا نکل گیا ہے جس سے اس کی نسبت قیاس کیا جا سکتا ہے - وہ لکھتے ہیں : ''قریب یک سال است کہ در گزشت'' یعنی جس وقت یہ تذکرہ زیر تالیف تھا - اس وقت مخلص کو مرے ایک سال ہوا تھا - مخلص کا سن وفات ۱۱۶۴ھ ہے - لہٰذا یہ قیاس بجا ہے کہ اس کا سن تالیف ۱۱۶۵ھ ہے اور چونکہ گردیزی نے اپنا تذکرہ میر صاحب ہی کے جواب میں لکھا ہے جس کے متعلق میں تذکرہ ریختہ‌گویاں مولفہ گرویزی کے مقدمے میں مفصل بحث کر چکا ہوں ، اس لیے اس سنہ کی صحت کی پوری تصدیق ہو جاتی ہے - البتہ اس سنہ میں دو تذکرے اور تالیف ہوئے تھے - ایک تحفۃ الشعرا مؤلفہ افضل بیگ قاقشال اورنگ آبادی اور دوسرا گلشن گفتار مؤلفہ خواجہ خان حمید اورنگ آبادی - لیکن ان کا علم میر صاحب کو مطلق نہیں تھا - بلکہ میر صاحب کے بعد بھی جس قدر مشہور تذکرہ نویس ہوئے ہیں - مثلاً قائم ، میر حسن ،

مصحفی ، قاسم ، شوق وغیرہ ، وہ سب ان سے لاعلم تھے ۔ چند تذکرے میر صاحب سے قبل بھی لکھے گئے تھے ۔ مثلاً تذکرۂ سید امام الدین بہ عہد محمد شاہ ، جس کا حوالہ میر حسن نے اپنے تذکرے میں دیا ہے ۔ تذکرۂ خان آرزو ، مگر یہ تذکرۂ فارسی شعرا کا ہے ۔ تذکرۂ سودا ، اس کا حوالہ دو جگہ قدرت اللہ قاسم نے اپنے تذکرے مجموعہ نغز میں دیا ہے ۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسے کچھ غلط فہمی ہوئی ہے ۔ غالباً وہ قائم کے تذکرے کو سودا کا سمجھا ہے ۔ بہرحال میر صاحب کے سامنے ان میں سے کوئی تذکرہ نہ تھا اور نہ اب تک یہ دستیاب ہوئے ہیں" ۔ بہرحال میر کا تذکرہ اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ اردو شعراء کے تذکروں میں سب سے پہلے لکھا گیا ہے اور اس طرح اس نے اردو میں تذکرہ نویسی کی داغ بیل ڈالی ہے[1] ۔

نکات الشعرا میں اس وقت کے معروف اور غیر معروف شاعروں کا حال ، اُن کی شخصیت کا بیان ، ان کے کلام کا انتخاب اور اس پر رائے کا اظہار ہے ۔ میر نے دوسرے تذکرہ نویسوں کی طرح ان سب کے بیان میں اختصار سے کام لیا ہے ۔ لیکن اس اختصار میں خاصی جامعیت اور ہمہ گیری ہے ۔ میر جس شاعر کے بارے میں جتنی بات کہنی چاہتے ہیں وہ انہوں نے بڑی خوبی سے کہہ دی ہے ۔ ان کا مقصد شاعروں کا مختصر تعارف ہے ۔ اسی تعارف کے خیال سے انہوں نے چند سطریں ہر شاعر کے بارے میں لکھی ہیں ۔ ان سطروں سے یہ تعارف مکمل ہو جاتا ہے ۔ کیونکہ ان سطروں کو پڑھنے کے بعد اس شاعر کی شخصیت کی تصویر خود بخود آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے اور اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ کیسا آدمی اور کس طرح کا شاعر ہے ۔ میر کے ان جملوں میں بڑا ہی چونکا دینے والا انداز ہے جو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے ۔ مثلاً حضرت امیر خسروؒ کے بارے میں ان کا یہ کہنا کہ "مجمع کمالات وصاحب حالات فضائل او اظہر من الشمس است"۔ اگرچہ مختصر ہے لیکن ان کی شخصیت کو ہمارے سامنے ضرور پیش کر دیتا ہے ۔ سراج الدین علی خان آرزو کے متعلق یہ فقرے : "آب و رنگ باغ نکتہ دانی ، چمن آرائے گلزار معانی ،

۱ ۔ ڈاکٹر عبدالحق : مقدمہ تذکرۂ نکات الشعراء

متصرف ملک زور طلب بلاغت ، پہلوانِ شاعر عرصۂ فصاحت ، چراغ دودمان صفائے گفتگو کہ چراغش روشن باد'' اس حقیقت کو ضرور واضح کر دیتے ہیں کہ خان آرزو کی حیثیت ادب و شعر کی دنیا میں کیا تھی۔ میرزا مظہر جان جاناں کے بارے میں ان کا یہ لکھنا کہ ''مردے است مقدس ، مطہر ، درویش ، عالم ، صاحب کمال ، شہرۂ عالم بے نظیر ، معزز ، مکرم'' فوراً ایک ایسے شخص کی تصویر ہمارے سامنے پیش کر دیتا ہے جو تقدس ، پاکیزگی اور علم میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ میاں مضمون کے بارے میں ان کے یہ الفاظ ''حریف ، ظریف ، بشاش ، بشاش ، ہنگامہ گرم کن مجلسہا'' اس بات کو واضح کر دیتے ہیں کہ وہ کیسے دلچسپ اور بزم آرا آدمی تھے۔ اسی طرح مرزا رفیع سودا کے متعلق صرف یہ لکھنا کہ ''جوانے است خوش خلق ، خوش خوئے ، گرم جوش ، یار باش ، شگفتہ روئے۔'' ان کی نشاطیہ طبیعت کو واضح کر دینے کے لیے کافی ہے اور درد کے بارے میں یہ جملے ''جوش بہارِ گلستانِ سخن ، عندلیب خوش خوان چمن این فن ، زبان گفتگویش گرکشائے زلف شام مدعا۔ مصرع نوشتہ اش برکاغذ از کاکل صبح خوش نما طبع سخن پرواز او سرو مائل چمنستان انداز ست۔ گاہے در کوچۂ باغ تلاش بہ طریق گل گشت قدم رنجہ می فوماید۔ در چمن شعرش لفظ رنگین چمن چمن ، گل چین خیال او گل معنی دامن دامن ، شاعر ز در آور ریختہ در کمال علاقگی وارستہ ، خلیق ، متواضع ، آشنائے درست۔'' ان کی اہم شخصیت کی مکمل تصویر ہمارے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ غرض ہر شاعر کو انہوں نے کچھ اسی انداز سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے ، اور ان کا انداز پوری طرح کامیاب ہے۔ کیونکہ ان کی تحریر سے ہر شاعر کی شخصیت کا صحیح تعارف ہو جاتا ہے۔ میر نے ایسا کر کے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ اس انداز بیان میں فارسی کی روایتی نثر کا مسجع اور مقفلی اسلوب ضرور ہے۔ رنگینی اور پر کاری بھی کہیں کہیں موجود ہے لیکن میر نے اس کو کسی مقصد سے استعمال کیا ہے۔ وہ صرف الفاظ کی بازی گری نہیں ہے۔ بلکہ اس میں گہری معنویت ہے۔ یہی ان کی شخصیت نگاری کی جان ہے ، اور یہ شخصیت نگاری ان کے

تذکرے نکات الشعرا کا ایک اہم پہلو ہے ۔

میر کے اس تذکرے کی ایک اور اہم خصوصیت اس کی تنقید ہے ۔ انھوں نے اس میں کھرے تنقیدی شعور کا اظہار کیا ہے ۔ اس تنقیدی شعور کا احساس وہاں ہوتا ہے جہاں شاعروں کے کلام پر رائے دی گئی ہے ۔ میر کی رائیں بڑی جچی تلی اور حقیقت پر مبنی ہیں ۔ ان میں اختصار کے ساتھ ہمہ گیری بھی ہے ۔ ان آرا سے پتہ چلتا ہے کہ میر کے پاس شعر و ادب کو جانچنے اور پرکھنے کے بعض معیار بھی ہیں ۔ انھیں معیاروں اور اصولوں کی روشنی میں وہ اظہار خیال کرتے ہیں ۔ اسی لیے ان کی بات بے بنیاد نہیں ہوتی ۔ بلکہ اس میں گہرائی کا احساس ہوتا ہے اور توازن کی خصوصیت نظر آتی ہے ۔ سودا کے بارے میں ان کا یہ اظہار خیال کہ غزل و قصیدہ ومثنوی و قطعہ و مخمس و رباعی ہمہ را خوب می گوید ۔ سرآمد شعرائے ہندی اوست ۔ بسیار خوش گو است بلاگرداں ہرشعرش طرف لطف رستہ رستہ ، در چمن بندی الفاظش گل معنی دستہ دستہ ۔ ہر مصرعہ برجستہ اش را سرو آزاد بندہ ، پیش فکر عالیش طبع عالی شرمندہ ۔ شاعر ریختہ ۔ چنانچہ ملک الشعرائی ریختہ او را شاید"۔ اور تاباں کے متعلق یہ رائے کہ "ہر چند عرصہ سخن او ہمیں در لفظہائے گل و بلبل تمام است اما بہ رنگیں می گفت" یا میر سجاد کے کلام کے متعلق یہ خیال کہ "چنیں خوش گر و معنی یاب اگرچہ در بند لفظ تازہ است لیکن برزبان خامہ او خیلہائے معنی سیاہی می کند ۔ ان کے تنقیدی شعور کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے ۔ کم و بیش تمام شاعروں پر انھوں نے اسی انداز میں تنقیدی رائیں دی ہیں اور یہ رائیں تنقیدی اعتبار سے خاصی اہم ہیں ، البتہ کہیں کہیں دو ایک شاعروں کے بارے میں میر نے ایسے خیالات کا اظہار بھی کر دیا ہے ، جن میں حقیقت کا مشائبہ بھی نہیں ۔ لیکن اس کا سبب ادبی یا فنی معیار نہیں بلکہ ذاتی پسند یا ناپسند ہے ۔ میر کی یہی ایک کمزوری تھی ۔ بہرحال یہ خامی میر کے یہاں موجود ہے ۔ لیکن اس سے ان کے تنقیدی شعور کی نفی نہیں ہوتی ۔ جہاں جہاں انھوں نے اس سے کام لیا ہے ، وہاں نکات الشعرا میں اعلی درجے کی تنقید پیدا ہوئی ہے ، اور اسی تنقید کی وجہ سے اس کا مرتبہ بہت بلند ہوگیا ہے ۔

”نکات الشعرا“ ان سب باتوں کے علاوہ خود میر کی شخصیت کا بھی ایک حسین مرقع ہے ۔ اس زمانے کا شاعرانہ ماحول کیسا تھا اور اس سے وہ کیا تعلق رکھتے تھے ؟ مختلف شعرا سے ان کے تعلقات کی نوعیت کیا تھی ؟ وہ ان سے کس طرح ملتے جلتے تھے ؟ انہوں نے جو شاعرانہ فضا قائم کی تھی اس میں خود میر کی کیا حیثیت تھی ؟ وہ کن محفلوں میں شریک ہوتے تھے ؟ ان کا وقت کس طرح گزرتا تھا ؟ وہ کن شاعروں کو برا سمجھتے تھے اور کیوں برا سمجھتے تھے ؟ ان کے مزاج میں کیسی شگفتگی تھی ؟ کس طرح وہ شاعروں پر فقرے چست کر دیتے تھے ؟ کس طرح ان میں سے بعض کے ساتھ اچھا وقت گزارتے تھے ؟ کس طرح شطرنج کھیلتے اور گپ کرتے تھے ۔ شعر و شاعری کی کون سی محفلیں منعقد ہوتی تھیں اور میر ان میں کس طرح شرکت کرتے تھے ؟ ان کا وقت کس طرح ہنسی مذاق میں گزرتا تھا ۔ کن لوگوں سے انہیں دلچسپی تھی اور کون سے لوگ ایسے تھے جن سے وہ نفرت کرتے تھے ؟ انہیں کون سی باتیں پسند تھیں اور کن باتوں کو وہ ناپسند کرتے تھے ؟ زندگی اور فن کے کون سے اصول تھے جن سے انہیں لگاؤ تھا ؟ غرض اس طرح کی بے شمار باتیں اس تذکرے میں ہیں اور ان باتوں سے میر کی شخصیت کے خد و خال نمایاں ہوتے ہیں اور ان کے ذہنی میلانات کا پتہ چلتا ہے ۔

میر کی تصانیف میں اسی لیے نکات الشعرا کو ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔

(۴)

ذکر میر ، میر کی اور اہم تصنیف ہے ۔ اس کتاب میں میر نے اپنی زندگی کے حالات لکھے ہیں ۔ میر کو سمجھنے اور ان کی شخصیت سے آشنا کرنے میں بڑی مدد دیتی ہے ۔ ان کی شخصیت اور کردار ، افکار و خیالات اور ذہنی میلانات کا اس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے اور اس زمانے کے سیاسی معاشرتی اور تمدنی حالات پر بھی اس سے خاصی روشنی پڑتی ہے ۔ اس کی تالیف کا سبب انہوں نے خود اس کتاب کے شروع میں بیان کیا ہے لکھتے ہیں :

"می گوید فقیر میر محمد تقی المتخلص بہ میر کہ دریں ایام بیکار بودم ، در گوشۂ تنہائی بے یار ۔ احوال خود را متضمن حالات و سوانح روزگار و حکایات و نقلہا نگاشتم و بنائے خاتمہ ایں نسخۂ موسوم بہ ذکر میر برلطائف گزاشتم ۔"

اور اس میں شک نہیں کہ اس کتاب میں ان باتوں کی خاصی تفصیل موجود ہے ۔ دلچسپ بات یہ ہے ، کہ میر نے اپنے نجی حالات کو بیان کرتے ہوئے اس زمانے کے ماحول کا بہت ہی تفصیل سے تذکرہ کیا ہے ۔ اس میں میر نے اپنے بزرگوں کا ذکر کیا ہے اور اس بات کی وضاحت کی ہے کہ وہ کس طرح ہندوستان آئے اور یہاں انہیں کن حالات سے دوچار ہونا پڑا ؟ پھر اپنے والد کی شخصیت پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور ان کی سیرت اور نصائح کا بیان کیا ہے ۔ اس کے بعد سید امان اللہ کے حالات بیان کیے ہیں جو ان کے والد کے مرید ہو جاتے ہیں اور جن کے زیر سایہ میر کی تربیت ہوتی ہے ۔ میر نے اس کے بعد اپنے والد میر علی متقی اور اپنے منہ بولے چچا سید امان اللہ کی وفات کا ذکر کیا ہے اور اس بات کی وضاحت کی ہے کہ ان کی وفات کے بعد ان پر کیا گزری ؟ وہ کس طرح پریشان رہے ؟ عرصہ حیات ان پر تنگ ہوگیا اور مجبوراً انہیں اکبرآبا چھوڑ کر دلی جانا پڑا ۔ جہاں وہ تلاش معاش میں سرگرداں پھرتے رہے ۔ بڑی مشکل سے صمصام الدولہ امیر الامرا کے دربار میں جانے کی ایک صورت نکلی اور وہاں سے روزینہ مقرر ہوا ۔ لیکن چند مہینے ہی گزرے تھے کہ نادر شاہ کا حملہ ہوا اور وہ مارے گئے۔ اور وہ روزینہ بند ہوگیا ۔ اس کے بعد میر کو جن ناسازکار حالات سے دوچار ہونا پڑا اپنوں کی بے وفائی اور زمانے کی ستم گاری کے ہاتھوں آن پر جوکچھ گزری ، اس کا مفصل بیان کیا ہے ۔ شاید اس زمانے کے سیاسی حالات کی اتنی تفصیل اس وقت کی کسی اور کتاب میں نہیں مل سکتی میر نے ان ہنگاموں میں جس طرح زیست کرنے کی کوشش کی اور جو ملازمتیں کی ہیں ، جہاں جہاں وہ گئے ہیں ، جن حالات کا انہیں سامنا کرنا پڑا ہے ، ان کو بڑی وضاحت سے پیش کیا ہے اور پھر میر نے یہ لکھا ہے کہ جب ان حالات نے زیست دشوار کر دی اور پانی سر سے اونچا ہوگیا تو دلی انہیں

چھوڑنی پڑی اور وہ لکھنؤ پہنچے ، جہاں انھوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام گزارے ۔

ذکر میر کا لطف حالات و واقعات کی مصورانہ تفصیل ، ذہنی و جذباتی ،میلانات کی فن کارانہ ترجمانی اور معاشرتی و تہذیبی معاملات کی عکاسی میں ہے ۔ اور اس طرح میر کی شخصیت ، ان کے افکار و خیالات اور اور ذہنی و جذباتی میلانات کی تصویر کو یہ کتاب بڑی خوبی سے پیش کرتی ہے ۔

یہ ایک نادر الوجود کتاب تھی ، لیکن ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے اس کو انجمن ترقی اردو سے شائع کرکے عام کر دیا ہے ۔ ۱۹۳۵ء میں یہ کتاب اورنگ آباد سے شائع ہوئی ۔

(۵)

''ذکر میر'' کے علاوہ میر نے ایک اور کتاب فیض میر کے نام سے لکھی ہے ۔ یہ کتاب اس لحاظ سے بہت دلچسپ ہے کہ اس سے میر کے مذہبی معتقدات اور عقائد و توہمات کا علم ہوتا ہے اور زندگی میں ان کی عجیب و غریب دلچسپیوں کی تفصیل معلوم ہوتی ہے ۔ میر کی شخصیت کو سمجھنے میں اس کتاب کی بھی خاصی اہمیت ہے ۔ ویسے اس کتاب کو کتاب بمشکل ہی سے کہا جا سکتا ہے ۔ کیونکہ یہ تو بہرحال ایک مختصر سا رسالہ ہے ۔ جس میں چند درویشوں کی حکایتیں بیان کی گئی ہیں ۔ ان کو تالیف کرکے کتابی صورت دینے کا سبب میر نے خود بیان کیا ہے ۔ لکھتے ہیں :

''می گوید فقیر حقیر میر محمد تقی متخلص بہ میر کہ دریں ایام فیض علی پسر من ذوق خواندن ترسل پیدا کردہ بود ۔ حکایات خمسہ متضمن فوائد بسیار اندک فرصت نگاشتم و مراعات اسم او نمودہ نام نسخہ فیض میر گزاشتم[1] ۔''

---

۱ - فیض میر : صفحہ ۱

فیض میر پانچ حکایتوں پر مشتمل ہے ۔ ''ان حکایتوں میں میر نے اللہ والوں کے حالات اور پیروں کی کرامات بیان کی ہیں اور جو کچھ لکھا ہے وہ سنی سنائی نہیں ، آنکھوں دیکھی باتیں ہیں ۔ یہ واقعات ہوں یا میر صاحب کی خوش اعتقادی کے کرشمے ، بہرحال ان کی روشنی میں میر صاحب کی ذہنیت صاف نظر آتی ہے ۔ اور واضح ہو جاتا ہے کہ میر صاحب ایک فقیر منش بزرگ تھے ۔ صوفیوں اور درویشوں سے بڑی عقیدت رکھتے تھے ۔ ان کی خدمت کو اپنی عزت اور ان کی دل جوئی کو فرض انسانیت سمجھتے تھے ۔ ان کو خدا رسیدہ جانتے اور صاحب کرامت مانتے تھے ۔ تصوف اور الٰہیات کے مسائل سے بڑی دلچسپی تھی ۔ ان کو غور سے سنتے تھے اور سمجھنے اور یاد رکھنے کی کوشش کرتے تھے ۔ جس کی تربیت میر علی متقی اور میر امان اللہ کی گود میں ہوئی ہو ، اس کی طبعیت کا انداز اور کیا ہوتا''۔[1]

فیض میر بھی ذکر میر کی طرح عرصے تک نایاب رہی ۔ آزاد نے آب حیات میں اس رسالے کا ذکر کیا تھا ۔ لیکن عرصے تک اس کا پتہ نہ چلا ۔ بالاخر پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب کو اس کا ایک قلمی نسخہ مل گیا اور انھوں نے اس کو مرتب کرکے مع مقدمے اور اردو ترجمے کے نومبر ۱۹۲۹ء میں نظامی پریس لکھنؤ میں چھپوا کر شائع کر دیا ۔

یہ تصانیف میر کی زندگی کا سرمایہ ہیں ۔ انھیں کے سہارے انھوں نے زندگی بسر کی ہے ۔ ان کی زندگی کا سارا وقت انھیں کو بنانے سنوارنے میں گزرا ہے ۔ اگر ان کے یہ مشاغل نہ ہوتے تو ان کے لیے زیست کرنی مشکل ہو جاتی اور زندگی کی تاریک رات ان سے کاٹے نہ کٹتی ۔ حقیقت یہ ہے کہ ان تخلیقی مشاغل ہی نے انھیں زندہ رکھا ہے اور جن کا مظہر یہ تصانیف ہیں ۔

اگرچہ میر کی یہ تمام تصانیف اپنی اپنی جگہ اہم ہیں ، ان میں سے ہر ایک ان کی تخلیقی صلاحیتوں کی آئینہ داری کرتی ہے ۔ لیکن اس

---

۱ ۔ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب : مقدمہ فیض میر صفحہ ۸

میں شک نہیں کہ بنیادی طور پر وہ ایک شاعر ہیں اور ان کے تخلیقی جوہر اسی صنف ادب میں کھلتے ہیں - ساری زندگی انہیں اسی سے دلچسپی رہی ہے - اسی کے سہارے وہ زندہ رہے ہیں اور یہی اُن کی زندگی کا ماحصل بھی ہے - اسی لیے ان کی شعری تصانیف اُن کی زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہیں اور اُن کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اپنے زمانے میں میر نے شاعری کو ، اور شاعری نے میر کو زندہ رکھا ہے -

۶

میر کا فنی شعور

میر صرف شاعر ہی نہیں تھے، فن شعر کا گہرا شعور بھی رکھتے تھے۔ اس شعور کا اظہار انہوں نے جگہ جگہ اپنی شاعری میں کیا ہے۔ مختلف زاویوں سے اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے فن کے تمام پہلوؤں پر بخوبی غور کیا تھا اور غور کرکے اس کے بنیادی مقتضیات کو عملی طور پر برتنے کی کوشش کی تھی۔ چنانچہ فکر و عمل کی ایک ایک ہم‌آہنگی بھی ان کے یہاں نظر آتی ہے اور وہ فن کے اسی گہرے شعور کا بنیادی نتیجہ ہے۔ اسی میں اُن کی عظمت کا راز مضمر ہے۔ شاعری کرنا آسان ہے، لیکن فن شعر کا گہرا شعور رکھنا آسان نہیں۔ یہ خاصا مشکل کام ہے۔ اس کے بغیر شاعری کو عظمت کا منہ دیکھنا نصیب نہیں ہوتا اور وہ بلندی اور ترفع سے ہمکنار نہیں ہو پاتی۔ میر کی شاعری میں جو عظمت بلندی اور ترفع ہے، وہ اُن کے اسی گہرے فنی شعور کی پیداوار ہے۔ یہ شعور یوں تو ہر شاعر میں ہوتا ہے لیکن گہرائی کے ساتھ اس کا اظہار ہر ایک کے

بس کی بات نہیں ہوتی - میر کو اس اعتبار سے بڑی اہمیت حاصل ہے کہ انہوں نے اس فنی شعور کا اظہار اس زمانے میں کیا ہے جب اس کی طرف توجہ عام نہیں تھی - اس وقت تو فن کا معیار تاثر تھا - افراد کے ذہنوں میں کچھ معیار ضرور موجود تھے - لیکن شاعروں سے اُن کے اظہار کی توقع نہیں کی جاتی تھی - میر اس اعتبار سے ایک اجتہادی حیثیت رکھتے ہیں - ہر چند کہ ان کا یہ عمل شعوری نہیں تھا - لیکن اس کے شعوری نہ ہونے ہی نے اس کی اہمیت بڑھا دی ہے—اور شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ انہیں فن کا ایک ماہر بلکہ مفکر بھی بنا دیا ہے - ان کے اس فنی شعور کے اظہار میں جگہ جگہ تنقیدی اقدار کے پیکر ابھرتے ہوئے نظر آتے ہیں - اس لیے یہ کہنا بے جا نہیں کہ میر ایک شاعر بھی ہیں اور فن کے ایک نقاد بھی !

فن کے بارے میں میر نے جو کچھ سوچا ہے ، اس کا مکمل اظہار تو اُن کی شاعری ہی میں ہوا ہے - لیکن ویسے کہیں کہیں ان کی دوسری تحریروں میں بھی اس کی جھلکیاں مل جاتی ہیں - ان کی غزلیں گہرے فنی شعور کی آئینہ دار ہیں - فن کے بنیادی مقتضیات کا شعور ان میں ہر جگہ کام کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے - اصول اور معیار ان میں قدم قدم پر اپنے آپ کو رونما کرتے ہوئے نظرآتے ہیں- فنی اقدار کی پاس‌داری ایک ایک شعر اور ایک ایک شعر کے ایک ایک لفظ میں اپنے آپ کو نمایاں کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے - غرض میر کی شاعری فن شعر سے دلچسپی رکھنے والے کے لیے بہ ذات خود ایک دنیا ہے - میر نے فنی شعور کے اظہار کے لیے اکثر و بیشتر اسی کو ذریعہ بنایا ہے ، اور اس رچے ہوئے فنی شعور اور اس کے اظہار کی خواہش ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ انہیں غزلوں کے اشعار میں کہیں کہیں وہ اس کے مختلف پہلوؤں پر خالص نظریاتی انداز میں اظہار خیال کرنے کے لیے مجبور ہوگئے ہیں - ان اشعار میں فن کے تمام نشیب و فراز کو بڑی دقت اور گہرائی کے ساتھ انہوں نے پیش کر دیا ہے - نکات الشعراء میں فن سے متعلق کوئی نئی بات میر نے نہیں کہی ہے - اس میں بھی فن کے متعلق کم و بیش وہی خیالات و نظریات ہیں جو ان کے اشعار میں ملتے ہیں - البتہ ان کے

اظہار کی نوعیت بدل گئی ہے - شعراء کے تذکرے میں ان کے فن کا جائزہ لیتے ہوئے انہوں نے ان نظریات کو سامنے رکھا ہے ، اور اشعار کے انتخاب میں کہیں کہیں مختلف اشعار پر جو اصلاحیں دی ہیں ، ان کے پیچھے بھی ان خیالات و نظریات کی جھلک نظر آ جاتی ہے۔غرض فنی شعور کا اظہار یہاں بھی ہوتا ہے - لیکن ویسے مجموعی طور پر اس سلسلے میں زیادہ اہمیت ان کے اشعار ہی کو حاصل ہے -

وہ خیالات و نظریات جن سے میر کے فنی شعور کا تانا بانا تیار ہوتا ہے ، بڑی اہمیت رکھتے ہیں - کیونکہ خود ان کے فن کی عمارت بھی انہیں کے سہارے کھڑی ہے - حقیقت یہ ہے کہ ان کے فن کا بنیادی محور یہی خیالات ہیں اور انہیں خیالات نے میر کو صحیح معنوں میں میر بنایا ہے -

میر کے فنی شعور میں خلوص اور صداقت ، حقیقت اور واقعیت کو بنیادی حیثیت حاصل ہے - وہ ان اقدار کا بڑا گہرا شعور رکھتے ہیں - اس کے بغیر ان کے نزدیک فن کی تخلیق ممکن ہی نہیں - کیونکہ یہی وہ اقدار ہیں جن کے ہاتھوں فن کا ہیولا تیار ہوتا اور اس میں جان پڑتی ہے - میر کے خیال میں شعر کی تخلیق کا محرک کوئی اہم واقعہ ، جذبہ یا کوئی اہم خیال ہوتا ہے۔شعر کے پردے میں انسان اپنے آپ کو پیش کرتا ہے ، اپنے آس پاس اور گرد و پیش کے ماحول کو پیش کرتا ہے - اسی لیے تو اس میں صداقت ہوتی ہے - حقیقت و واقعیت ہوتی ہے اور انہیں اقدار کے سہارے فن صحیح معنوں میں فن بنتا ہے -

میر نے جب یہ شعر کہا تھا :

کیا تھا شعر کو پردہ سخن کا
وہی آخر کو ٹھہرا فن ہمارا

تو گویا اس بنیادی خیال کی وضاحت کی تھی کہ شعر دل پر بیتی ہوئی کیفیات کے اظہار کا نام ہے - شاعر اپنی بات کہنا چاہتا ہے - جو کچھ اس کے دل پرگزرتی ہے ، اس کا اظہار ضروری سمجھتا ہے - یہی خواہش

اس کی باتوں کو فن بنا دیتی ہے ۔ میر کا فن اس کی بہت اچھی مثال ہے ۔ انھوں نے شعر کو سخن کا پردہ بنایا ہے ۔ اور بالآخر وہی ان کا فن ٹھہرا ہے ۔ ان کی زندگی غم سے عبارت تھی ۔ اس لیے ان کے سارے فن میں غم سنانے کی کیفیت ہے ۔ شعر کے پردے میں انھوں نے غم سنایا ہے اور اس طرح وہ ساری زندگی دل کا مرثیہ لکھ کر خود روتے اور دوسروں کو رلاتے رہے ہیں :

شعر کے پردے میں مَیں نے غم سنایا ہے بہت
مرثیے نے دل کو میرے بھی رلایا ہے بہت

یہ احساس میر کے یہاں اس حد تک بڑھا ہے کہ وہ اپنے آپ کو شاعر نہیں کہتے بلکہ ایک ایسا شخص تصور کرتے ہیں جو درد و غم کو جمع کرکے دیوان تیار کر لیتا ہے :

مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے
درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

میر کی زندگی چونکہ درد و غم سے عبارت تھی اور اُن کے پاس سوائے اس کے اور کچھ تھا ہی نہیں اس لیے وہ اسی کے اظہار کو شاعری سمجھتے تھے ۔ کیونکہ یہی ان کے نزدیک زندگی کی سب سے بڑی حقیقت تھی اور اس حقیقت کے اظہار کے بغیر ان کے لیے غزل کہنا ممکن ہی نہیں تھا — وہی غزل کے پردے میں اشعار سنانے والی بات تھی ۔ ورنہ کہاں میر اور کہاں غزل :

کب اور غزل کہتا میں اس زمیں میں لیکن
پردے میں مجھے اپنا احوال سنانا تھا

میر نے اس طرح کے اشعار میں جو خیالات و نظریات پیش کیے ہیں ، وہ بادی‌النظر میں اسی معنویت کے حامل ہیں کہ اصلیت اور واقعیت ، خلوص اور صداقت شعر کی تخلیق کے بنیادی محرکات ہیں ۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو ان میں بعض اور پہلو بھی نکلتے ہیں ۔ اصلیت اور واقعیت کے ساتھ ساتھ میر ان اشعار میں یہ بھی کہنا چاہتے ہیں کہ درد و غم

زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہے ۔ اس لیے فن میں دردمندی کے عنصر کا ہونا بھی لازمی ہے ، کہ اس کے بغیر اس میں گداز کی کیفیت پیدا نہیں ہو سکتی اور دوسرے یہ کہ شعر میں درد و غم کے اظہار سے فن کار نہ صرف اپنے لیے بلکہ دوسروں کے لیے بھی زندگی کی تلخیوں کو گوارا بنا لینے کا احساس پیدا کرتا ہے ۔ اسی لیے تو وہ کہتے ہیں :

پھرتا ہے کیا تو میر گلستاں میں غم زدہ
کچھ دل خراش لکھ بھی قلم اک تراش کر

کیونکہ ایسا کرنے سے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے اور فنی تخلیق زندگی کے لیے ایک آسودگی کا سامان بہم پہنچاتی ہے ۔

میر کے نزدیک زبان دل کی ترجمان ہے ۔ جو شاعر کے دل میں آتا ہے وہی کہتا ہے ۔ گویا شعر جذبے کی زبان ہے ۔ جذب و کیفیت کے بغیر صحیح شعر کی تخلیق ناممکن ہے ۔ میر نے اگرچہ یہ شعر :

جو دل میں آتا ہے کہنے میں بھی وہ
زباں میرے دل کی مگر ترجماں ہے

اپنے بارے میں کہا ہے لیکن درحقیقت اس میں فن شعر کے متعلق ایک عالمگیر حقیقت کی وضاحت کی ہے—اس کی تہہ میں یہی بنیادی خیال ہے کہ خلوص شعر کی بنیاد ہے ، لیکن یہ خلوص صحیح جذبے اور کیفیت کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتا ، میر کے اس شعر سے اس بنیادی خیال پر کچھ اور بھی روشنی پڑتی ہے :

کب ہیں جوانی کے سے اشعار شور آور
شاید کہ کچھ ہوئے ہیں اب پیر میر صاحب

ظاہر ہے جوانی کے زمانے کے اشعار کی شور آور کیفیت پیری میں باقی نہیں رہ سکتی ۔ کیونکہ وقت کے ساتھ ساتھ جذبات سرد ہوتے جاتے ہیں ، ولولہ و شوق کے چراغ جھلملانے لگتے ہیں اور انسان میں تیزی و تندی باقی نہیں رہتی ۔ اسی لیے زندگی کے مختلف ادوار میں شاعر

کے تصورات بدلتے رہتے ہیں ۔ کیونکہ سن کے تقاضے سے خود اس کی ذہنی کیفیت میں تبدیلی ہو جاتی ہے ۔

میر نے اس بنیادی خیال کو پیش کر کے فن شعر کے متعلق ایک اہم حقیقت کا اظہار کیا ہے ۔

فنِ شعر کے بارے میں خونِ جگر کی اصطلاح جس کو موجودہ دور میں علامہ اقبال نے ایک فلسفیانہ رنگ میں استعمال کیا ہے ، سب سے پہلے میر ہی نے تراشی ہے ۔ ان کے کئی شعر ایسے ملتے ہیں جن میں انھوں نے اس خیال کی وضاحت کی ہے کہ فن شعر کا خون جگر کے ساتھ بڑا گہرا ربط ہے ۔ خونِ جگر کے بغیر شعر میں زندگی پیدا نہیں ہوتی ۔ یہ خونِ جگر اس میں زندگی کی لہر دوڑاتا اور جولانی کی بجلیاں بھرتا ہے ——ان اشعار میں یہ بنیادی خیال موجود ہے :

مصرع کوئی کوئی کبھو موزوں کروں ہوں میں
کس خوش سلیقگی سے جگر خوں کروں ہوں میں

———

غزل میر یاں کوئی موزوں کرو
تامل کرو ، دل جگر خوں کرو

صاف ظاہر ہے کہ میر کے خیال میں غزل کا موزوں کرنا اور جگر کو خون کیے بغیر ممکن نہیں اور نہ صرف غزل بلکہ ایک مصرع کے موزوں کرنے میں بھی جگر خون کرنے کی ضرورت ہوتی ہے ۔

میر نے دل و جگر خون کرنے کی جو اصطلاحیں استعمال کی ہیں ، ان میں گہری معنویت ہے ۔ اس کے دو پہلو تو بہت واضح نظر آتے ہیں ۔ ایک تو یہ کہ بغیر شدید احساس اور پرخلوص جذبے کے کوئی ایسا خیال پیدا نہیں ہوتا جو شعر کی تخلیق کے لیے زمین تیار کر سکے ۔ اس کے لیے تو لہو رونا پڑتا ہے ۔ آگ اور خون کی راہوں سے گزرنے کی ضرورت ہوتی ہے ۔ تب کہیں جا کر غزل اور مصرع کے موزوں کرنے کا سامان بہم پہنچتا ہے ، اور دوسرے یہ کہ غزل کا کہنا یا مصرعوں کا موزوں کرنا

شاعر کے بائیں ہاتھ کا کھیل نہیں ہوتا ۔ اس کے لیے تو خاصی کاوش درکار ہوتی ہے ۔ گویا میر بھی یہ کہنا چاہتے ہیں کہ فن شعر کی تخلیق کوئی اضطراری فعل نہیں ہے ۔ صرف احساس کی شدت اور جذبے کا خلوص ہی اس کے لیے کافی نہیں ۔ یہ دونوں چیزیں شعر کے قالب میں ڈھلنے کے لیے محنت اور کاوش کا تقاضا کرتی ہیں ۔ اس لیے یہ محنت اور کاوش شاعر کے مزاج کا جزو ہونا چاہیے ۔ اس کے بغیر شعر ظاہری حسن سے مزین نہیں ہو سکتا اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو اس کا معنوی حسن بھی پس منظر میں جا پڑتا ہے ۔ کیونکہ یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔۔۔ ایک کی طرف سے بے توجہی دوسرے کے چراغ کو بھی گل کر دیتی ہے ۔

درحقیقت میر یہ کہنا چاہتے ہیں کہ شعر کی تخلیق میں خلوص کے ساتھ محنت اور کاوش اس لیے ضروری ہے کہ اس سے فن میں نکھار پیدا ہوتا ہے اور ایک ہیرے کی طرح ترشی ہوئی کیفیت وجود میں آتی ہے ۔ اسی لیے میر کے نزدیک فن شعر اور اس کی تخلیق اتنا آسان کام نہیں جتنا لوگ اسے سمجھ لیتے ہیں۔۔۔انھیں جو اپنے فن کی عظمت کا احساس ہے ، وہ اسی وجہ سے ہے کہ ان کے یہاں یہ دونوں باتیں موجود ہیں اور ان کا یہ احساس غلط نہیں ہے ۔ ان کی شاعری اس کی آئینہ دار ہے ۔

معنوی اعتبار سے احساس کی شدت ، جذبے کے خلوص اور صوری اعتبار سے محنت اور جگر کاری کو میر فن شعر کے لیے ضروری ضرور سمجھتے ہیں۔۔۔لیکن یہی چیزیں ان کے نزدیک حرف آخر نہیں ۔ فن شعر اپنی بلندیوں کو حاصل کرنے کے لیے ان زمینوں کو چھوڑ کر نئے افق پر پرواز بھی کرتا ہے ، اور یہ پرواز اتنی اونچی ہوتی ہے کہ وہ فکر بلند تک پہنچ جاتا ہے۔۔۔بغیر فکر بلند کے شعر میں گہرائی اور ہمہ گیری پیدا نہیں ہوتی ۔ محض احساس کی شدت اور صرف جذبے کے خلوص سے فن فن نہیں بنتا ، اور اس کو عظمت سے ہم کنار ہونے کا موقع نہیں ملتا ۔ یہ عظمت تو فکر و شعور ہی اس میں پیدا کرتے ہیں ۔ اسی سے اس میں وہ توازن اور نکھار بھی وجود اختیار کرتا ہے جو فن کی جان ہے ۔ میر

نے کئی جگہ اس فکر بلند کا تذکرہ کیا ہے ۔ شعر کہنے کو وہ فکر کرنے کا مترادف خیال کرتے ہیں ۔ اگر یہ بنیادی خیال ان کے پیش نظر نہ ہوتا تو وہ اس طرح کے شعر نہ کہتے :

فکر بلند سے میں کیا آسماں اسے
ہر اک سے میر خوب ہو یہ وہ زمیں نہیں

بات بنانا مشکل سا ہے ، شعر سبھی یاں کہتے ہیں
فکر بلند سے یاروں کو ایک ایسی غزل کہہ لانے دو

یہ ٹھیک ہے کہ 'فکر بلند' کی اصطلاح یہاں صرف شعور اور فلسفیانہ غور و فکر کے لیے استعمال نہیں ہوئی ہے ، لیکن فکر بلند سے یہاں مطلب صرف مضمون آفرینی بھی نہیں ہے ، بلکہ میر فکرِ بلند کو احساس ، جذبے اور شعور تینوں کے مجموعے کے لیے استعمال کرتے ہیں ۔ مطلب ان کا یہ ہے کہ شعر میں جب تک غور و فکر اور سوچ بچار کے عناصر شامل نہ ہوں ، اس وقت تک اس میں گہرائی اور گیرائی کا وجود نہیں ہوتا اور یہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں ۔ شعر کہنے کو تو سبھی کہہ لیتے ہیں ، کیونکہ جذبہ تو سب کے پاس کسی نہ کسی حد تک ہوتا ہی ہے ، لیکن فکر و شعور کے عناصر سے کام لینا ہر ایک کے لیے آسان نہیں ہوتا ۔ یہ تو اسی شاعر کے لیے ممکن ہے جو احساس اور جذبے کی فلسفیانہ تحلیل کی صلاحیت رکھتا ہو ــــ یہ صلاحیت میر کو اپنے فن میں نظر آتی ہے ــــ اور یہ ان کی خود ستائی اور مبالغہ آرائی نہیں ہے ۔

لیکن اس خیال کے حقیقت ہونے کے باوجود اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ 'فکرِ بلند' کی اصطلاح میں صناعی کا خیال موجود ضرور ہے ۔ میر نظریاتی طور پر اس کے قائل تھے ۔ 'خون جگر' کی اصطلاح میں بھی اس خیال کی جھلک موجود تھی ۔ یہ خیال حقیقت بن جاتا ہے جب میر کے یہاں کئی جگہ فن شعر کے سلسلے میں اپنے صناع ہونے اور باتیں بنانے کا ذکر ملتا ہے ۔

میر صناع ہے ملو اس سے
دیکھو باتیں تو کیا بناتا ہے

صناعِ طرفہ ہیں ہم عالم میں ریختے کے
جو میر جی لگے گا تو سب ہنر کریں گے

'باتیں بنانا' میر کی مخصوص اصطلاح ہے اور وہ برابر اسے صناعی اور بنانے سنوارنے کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں :

عشق کیا ، سو باتیں بنائیں یعنی شعر شعار ہوا
بیتیں جو وے مشہور ہوئیں تو شہروں شہروں رسوا تھے

غزل اک اور بھی اس گل زمیں میں قصد ہے کہیے
ہوئی ہے اب تو خو آخر ہمیں باتیں بنانے کی

بات بنانا مشکل سا ہے شعر سبھی یاں کہتے ہیں
فکرِ بلند سے یاروں کو اک ایسی غزل کہہ لانے دو

ہے تصنع کہ لعل میں وے لب
یعنی اک بات سی بنائی ہے

ان اشعار میں 'بات بنانا' ایک مخصوص معنی میں استعمال ہوا ہے — بات بنانے کا جو مفہوم عام طور پر اردو میں مروج ہے ، اس کو میر نے بدل دیا ہے اور اس کو ایک فنی اور تنقیدی اصطلاح بنا کر اس کے مفہوم میں جو وسعت پیدا کی ہے ، وہ ان کے فنی شعور کی اجتہادی کیفیت پر دلالت کرتی ہے — بہر حال اس میں صناعی کا خیال پوشیدہ ہے اور میر نے اس صناعی کے خیال کو اس حد تک اہمیت دی ہے کہ اگر اس میں کوئی کمال حاصل کر لے تو ان کے خیال میں وہ ایک

تحریک کا پیش خیمہ بن سکتا ہے ، جس سے فن میں نئی زندگی کے آثار رونما ہو سکتے ہیں ۔ لیکن اس صناعی میں طرفگی کا ہونا لازمی ہے :

صناعِ طرفہ ہیں ہم عالم میں ریختے کے
جو میر جی لگے گا تو سب ہنر کریں گے

میر نے خود یہ ہنر کیا ہے اور اس ہنر کو کرنے کے لیے زمین بھی تیار ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کا فن اس اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے ۔ کیونکہ اس نے بہت سی نئی راہیں دکھائی ہیں——اس لیے ان کے فن کو ایک تحریک سے تعبیر کرنا بے جا نہیں——میر کو خود بھی اس کا احساس ہے ۔ چنانچہ کہتے ہیں :

دل کس طرح نہ کھینچیں اشعار ریختے کے
بہتر کیا ہے میں نے اس عیب کو ہنر سے

———

اس فن میں کوئی بے تہ کیا ہو مرا معارض
اول تو میں سند ہوں پھر یہ مری زباں ہے

———

دیوان میر صاحب ہر ایک کی ہے بغل میں
دو چار شعر ان کے ہم بھی لکھا کریں گے

———

گفتگو ریختے میں ہم سے نہ کر
یہ ہماری زبان ہے پیارے

———

گر دیکھو گے تم طرزِ کلام اس کی نظر کر
اے اہلِ سخن میر کو استاد کرو گے

———

اگرچہ گوشہ گزیں ہوں میں شاعروں میں میر
یہ میرے شور نے روئے زمیں تمام لیا

نہ رکھو کان نظم شاعرانِ حال پر اپنے
چلو ٹک میر کو سننے کہ موتی سے پروتا ہے

سخن دس پانچ یاں ہیں جمع کس حسن و لطافت سے
تفاوت ہے مرے مجموعہ و عقدِ ثریا میں

زمینِ غزل ملک سی ہوگئی
یہ قطعہ تصرّف میں بالکل کیا

دور تک رسوا ہوا ہوں، شہروں شہروں ملک ملک
میرے شعر و شاعری کا تذکرہ گھر گھر ہے اب

شعر ہمارے عالم کے ہر چار طرف کیا دوڑے ہیں
کس وادی آبادی میں یہ حرف و سخن مشہور نہیں

ملکوں ملکوں شہروں شہروں قصبہ قریہ دیہہ و دیار
شعر و بیت و غزل پر اپنے ہنگامہ ہے گھر گھر آج

کس کس ادا سے ریختے میں نے کہے ولیک
سمجھا نہ کوئی میری زباں اس دیار میں

خیر ، اس کو جملۂ معترضہ سمجھیے ـــــ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ یہاں یہ احساس صناعی ہی کے خیال نے پیدا کیا ـــــ اور صناعی کا مفہوم میر کے یہاں محدود نہیں ہے ـــــ وہ صوری حسن کے تمام پہلوؤں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے ۔ اس کے نشیب و فراز کی لہریں ان کی اس اصطلاح میں موجزن نظر آتی ہیں ۔ ان میں سے بعض پہلوؤں کی تو میر نے وضاحت بھی کی ہے ۔

اسلوب کا ذکر انھوں نے بار بار کیا ہے اور اسلوب ان کے نزدیک ایک طرزِ اظہار اور حسنِ ادا کا نام ہے ۔ فن شعر کی صوری خوبیاں اسی اسلوب سے عبارت ہیں ۔ اسی لیے اس اسلوب کے تحت زبان ، بیان ، الفاظ ، آہنگ ، ترنم ، نغمگی اور اسی طرح کی دوسری چیزیں بھی آ جاتی ہیں ۔ میر ان سب میں بھی ایک جدت اور اجتہاد کے قائل ہیں ۔ اسی لیے وہ فخر کے ساتھ اپنے فن کے اسلوب کا تذکرہ کرتے ہیں ۔ کیونکہ اسی اسلوب میں صوری حسن کے تمام پہلوؤں کا ایک حسین امتزاج انھیں سب سے زیادہ نظر آتا ہے :

میر شاعر بھی زور کوئی تھا
دیکھتے ہو نہ بات کا اسلوب

گر دیکھو گے تم طرزِ کلام اس کی نظر کر
اے اہلِ سخن میر کو استاد کرو گے

اس اسلوب کی تفصیل میر کے یہاں زیادہ نہیں ملتی ۔ لیکن ان باتوں سے اس بات کا اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ وہ اس اسلوب میں کون کون سی چیزوں کو ضروری سمجھتے تھے ۔ اس سلسلے میں انھوں نے زبان اور الفاظ کے صحیح استعمال کو بڑی اہمیت دی ہے کیونکہ انھیں سے اسلوب کے دوسرے پہلو بھی پیدا ہوتے ہیں ۔ میر نے اپنے اشاروں اور کنایوں میں ان سب پہلوؤں کو روشن کر دیا ہے :

نہ دیکھو کبھی موتیوں کی لڑی
جو دیکھو مری گفتگو کی طرف

سخن دس پانچ ہیں یاں جمع کس حسن و لطافت سے
تفاوت ہے مرے مجموعہ و عقدِ ثریا میں

ہر بیت میں کیا میر تری باتیں گتھی ہیں
کچھ اور سخن کر کہ غزل سلکِ گہر ہے

نہ رکھو کانِ نظم شاعرانِ حال پر اتنے
چلو ٹک میر کو سننے کہ موتی سے پروتا ہے

مربوط کیسے کیسے کہے ریختے ولے
سمجھا نہ کوئی میری زباں اس دیار میں

ہے نظم کا سلیقہ کہتے ہیں سب کو لیکن
جب جانیں کوئی لاوے یوں موتی سے پرو کر

اپنی گفتگو کو موتیوں کی لڑی کہنا ، غزل کی ہر بیت میں گتھی ہوئی باتوں کو سلکِ گہر سے تعبیر کرنا ، اپنی نظم کو موتی پرونے کے مترادف قرار دینا اور اپنے مجموعۂ الفاظ کی حسن و لطافت کو عقدِ ثریا سے بلند سمجھنا ، اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ میر ہر اسلوب کے تمام پہلو روشن تھے ، اور وہ ان سب کا گہرا شعور رکھتے تھے -

یہ اسلوب اور طرزِ کلام ان کے خیال میں اپنی انتہائی بلندیوں سے اس وقت آشنا ہوتا ہے جب اس میں ایک ستھرا پن ، ایک نکھری اور سنوری ہوئی کیفیت اور ایک رچا ہوا انداز پیدا ہو جائے——میر نے اسلوب کی ان بلندیوں کو نظیری کی شاعری میں دیکھا ہے——چنانچہ نظیری کے فن کی بلندیوں کا خیال اور خود ان بلندیوں سے ہم کنار ہونے

کا احساس انھیں ہمیشہ رہا ہے ۔ اس کا ذکر وہ بار بار کرتے ہیں :

نہ ہوئے ہم نظیری سے یوں تو
شعر کے فن میں بے نظیر ہوئے

کیا قدر ہے ریختے کی ، گو میں
اس فن میں نظیری کا بدل تھا

ہے جی میں غزل در غزل اے طبع یہ کہیے
شاید کہ نظیری کے بھی عہدے بر آوے

نظیری کے اسلوب کی جو خصوصیات ہیں ، ان کو سامنے رکھنے سے ان اشعار میں پیش کیے ہوئے تصورات کا صحیح علم ہوتا ہے ۔ میر نظیری کے رنگین اسلوب اور اس کے رچے ہوئے طرز ادا کا گہرا شعور رکھتے تھے ۔ اسی لیے انھوں نے اپنے اسلوب کو نظیری کے مقابلے میں رکھنے کی کوشش کی ہے ۔ یہ الگ بحث ہے کہ مجموعی طور پر اپنے اسلوب میں وہ ان خصوصیات کو پیدا بھی کر سکے ہیں یا نہیں جو نظیری کے اسلوب کے ساتھ مخصوص ہیں ۔ لیکن ان خصوصیات کا جو شعور ان کے پاس ہے ، اس سے انکار ممکن نہیں ۔

اور ایک نظیری ہی پر کیا منحصر ہے ۔ میر ہر شاعر کے اسلوب اور اس کے نشیب و فراز کو سمجھتے ہیں ۔ لیکن انھوں نے کسی اسلوب سے شعوری طور پر فائدہ نہیں اٹھایا ہے ۔ کیونکہ ان کے پاس اسلوب کو جدت کے سانچے میں ڈھالنے کا گہرا شعور بھی ہے——اسلوب کی عظمت کے لیے وہ اس جدت اور اچھوتے پن کو اصولی اور نظریاتی طور پر ضروری سمجھتے ہیں——اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ اس طرح اس کا اظہار نہ کرتے :

نکتہ دانانِ رفتہ کی نہ کہو
بات وہ ہے جو ہووے اب کی بات

گو کہ آتش زباں تھے آگے میر
اب کی کہیے ، گئی وہ تب کی بات

ان اشعار سے صاف ظاہر ہے کہ جدت ان کے نزدیک فن کا لازمی جز ہے - اس جدت اور اپچ کا خیال اگر باقی نہ رہے تو فن تقلید اور نقالی کی سرحدوں میں داخل ہو جاتا ہے - میر کا فنی شعور اس کو گوارا نہیں کرتا - اسی لیے تو وہ کہتے ہیں :

نہیں ملتا سخن اپنا کسو سے
ہماری گفتگو کا ڈھب جدا ہے

اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے کسی کو بھی انکار کی جرأت نہیں ہو سکتی - کیونکہ میر کا سارا کلام اس پر صداقت کی مہر لگاتا ہے -

میر نے اسالیب کی باریکیوں کو سمجھا ہے - اسی لیے جدت اور اپچ کی اہمیت انھوں نے محسوس کی ہے اور وہ خود اس کو عملی طور پر برتنے میں کامیاب ہوئے ہیں -

لیکن اس جدت اور اپچ کے شدید احساس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ روایت کی پاس داری کو ضروری نہیں سمجھتے - ایسا نہیں ہے - میر کے خیال میں روایت کی صحیح پاس داری کے ساتھ ہی جدت اور اپچ کو صحیح طور پر برتا جا سکتا ہے--اور اسی کا یہ اثر ہے کہ میر اصنافِ سخن کے مقتضیات اور ان کی ضرورت اور اہمیت کا بھی گہرا شعور رکھتے ہیں - ان پر یہ حقیقت روشن ہے کہ قصیدہ غزل نہیں ہو سکتا اور غزل قصیدہ نہیں بن سکتی - البتہ ضرورت کے پیش نظر بعض ایسی تبدیلیاں ان میں کی جا سکتی ہیں جو روایت کا خون نہ کریں اور جن سے اس صنف کے بنیادی مقتضیات کو ٹھیس نہ لگے---مثلاً غزل کی طوالت ان کے نزدیک نامناسب ہے - لیکن اگر موضوع اس کی اجازت دیتا ہے اور اس سے غزل کے بنیادی لوازم کو نقصان نہیں پہنچتا تو وہ

اس کے لیے بھی تیار ہو جاتے ہیں :

گو غزل ہو گئی قصیدہ سی
عاشقوں کا ہے طولِ حرف شعار

اس شعر میں غزل کو قصیدے کی طوالت سے ہم کنار کرنے کا جو خیال ملتا ہے ، اس کا جواز صرف یہ ہے کہ عاشق کا جذب و شوق ، شدت کے باعث طوالت کا تقاضا کرتا ہے ۔ گویا میر یہ کہنا چاہتے ہیں کہ بعض خاص حالات میں ، موضوع کے ساتھ ہم آہنگی کے پیش نظر ، غزل میں طوالت پیدا کی جا سکتی ہے——حالانکہ یہ طوالت اس کے مقتضیات میں سے نہیں ہے ۔ طوالت تو قصیدے کے ساتھ مخصوص ہے ۔

غزل میر کا خاص میدان ہے——اور وہ بنیادی طور پر غزل ہی کے شاعر ہیں ۔ اسی لیے اور اصنافِ سخن کے مقابلے میں غزل کے مقتضیات کا ان کے پاس گہرا شعور ہے——وہ ان تمام اصولوں کے قائل ہیں جن سے غزل صحیح معنوں میں غزل بنتی ہے لیکن ان میں سے اس کی رمزیت اور ایمائیت ، اشاروں اور کنایوں ، پیچ داری اور تہ داری ، ربط اور توازن کی طرف انھوں نے خاص طور پر توجہ دلائی ہے ۔ کیونکہ ان باتوں کو وہ غزل کی بنیاد سمجھتے ہیں :

اک آفتِ زماں ہے یہ میرِ عشق پیشہ
پردے میں سارے اپنے مطلب ادا کرے ہے

———

کب اور غزل کہتا میں اس زمیں میں لیکن
پردے میں مجھے اپنا احوال سنانا تھا

———

زلف سا پیچ دار ہے ہر شعر
ہے سخن میر کا عجب ڈھب کا

———

تیرے بالوں کے وصف میں میرے
شعر سب پیچ دار ہوتے ہیں

نہ رکھو کان نظمِ شاعرانِ حال پر اتنے
چلو ٹک میر کو سننے کہ موتی سے پروتا ہے

ان اشعار میں غزل کے بعض بنیادی اصولوں کا اظہار ہے ۔ ان کے بغیر غزل میں تغزل پیدا نہیں ہو سکتا ۔ وہ غزل نہیں بن سکتی ۔ کیونکہ ان کے ایک حسین اور متوازن امتزاج ہی کا نام غزل ہے ۔

میر نے غزل کی رمزیت ، ایمائیت ، اس کی تہ داری اور پیچ داری پر زور ضرور دیا ہے لیکن ایسا کرنے کے لیے وہ صرف غزل کو الفاظ کا گورکھ دھندا نہیں بنانا چاہتے ۔ بلکہ ان کے خیال کے مطابق ان سب کی تہوں میں گہری معنویت کا ہونا لازمی ہے ، ورنہ غزل میں ہمہ گیری نہیں پیدا ہو سکتی ۔ میر غزل کے مختلف اشعار میں گہرائی اور گیرائی دیکھنا چاہتے ہیں کیونکہ اس کے بغیر غزل کا مقصد پورا نہیں ہوتا ۔ اگر یہ معنویت اس کے اشاروں اور کنایوں میں نہ ہو تو وہ اپنے مرتبے سے گر جاتی ہے ۔ میر نے اپنے مخصوص انداز میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے :

سہل ہے میر کا سمجھنا کیا
ہر سخن اس کا اک مقام سے ہے

چاہیے وہ کہے سو لکھ رکھیں
ہر سخن میر کا کتاب ہے میاں

ہر بیت میں کیا میرؔ تری باتیں گتھی ہیں
کچھ اور سخن کر کہ غزل سلکِ گہر ہے

غزل میرؔ یاں کوئی موزوں کرو
تامل کرو دل جگر خوں کرو

غزل میں یہ معنویت دل جگر خون کیے بغیر پیدا نہیں ہوسکتی—
جب ایسا ہوتا ہے تب غزل کا ہر سخن کتاب بنتا ہے اور اس کی ہر بات
ایک مقام سے معلوم ہوتی ہے ، جس کا سمجھنا آسان نہیں ہوتا—یہ
خصوصیت ہو تو غزل سلک گہر بن جاتی ہے ۔ یہاں تک کہ مجموعۂ
عقدِ ثریا بھی اس کے سامنے گرد معلوم ہونے لگتا ہے ۔

لیکن غزل کی اس معنویت کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اس کے
سمجھنے میں دشواری پیش آئے ۔ ایسا نہیں ہے ۔کیونکہ میرؔ خواص پسند
ہونے کے باوجود غزل میں عمومیت اور افاقیت کے قائل ہیں—جب وہ
یہ کہتے ہیں :

شعر میرے ہیں سب خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

تو گویا اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ غزل میں عمومیت ہونی چاہیے ۔
لیکن اس سے اس کی گہرائی اور گیرائی پر حرف نہیں آتا ۔کیونکہ عمومیت
اور آفاقیت گہرائی اور گیرائی کے دشمن نہیں ہیں ۔

شاعری اور غزل میں عمومیت اور آفاقیت کے صحیح احساس اور
گہرے شعور ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ وہ شعر کے جادو اور غزل کے سحر
پر ایمان رکھتے ہیں ۔ کیونکہ خود انہوں نے اس کے اثر اور تاثر کو
دیکھا ہے اور اس اثر و تاثر میں جس سحر کی کیفیت پیدا ہوتی ہے ،
اس کو محسوس کیا ہے ۔ اسی لیے وہ تعلی کے رنگ میں اس کا اظہار

کرنے سے بھی باز نہیں رہے ہیں :

غزل میر کی کب پڑھائی نہیں
کہ حالت مجھے غش کی آئی نہیں

شاعر نہیں جو دیکھا تو تو ہے کوئی ساحر
دو چار شعر پڑھ کر سب کو رجھا گیا ہے

حقیقت یہ ہے کہ شعر پڑھ کر رجھانے والی کیفیت ایک ایسے شاعر ہی کا حصہ ہے جس کی شاعری میں ساحری ہو - میر نے یہ بات غلط نہیں کہی ہے - کیونکہ خود ان کی شاعری اس صورتِ حال کی ایک زندہ مثال ہے -

لیکن شاعری کو ساحری سمجھ کر متاثر ہونا ہر ایک کے بس کی بات نہیں - اس کے لیے میر کے خیال میں ، ایک مخصوص ذہنی اور جذباتی تربیت کی ضرورت ہے - خود شاعر کا سا کمال جب تک افراد میں موجود نہ ہو اس وقت تک ایسا ممکن نہیں :

سمجھے اندازِ شعر کو میرے
میر کا سا اگر کمال رکھے

اس شعر میں میر نے اسی بنیادی خیال کی وضاحت کی ہے کہ شعر سے اثر قبول کرنے کے لیے شاعر کی جذباتی اور ذہنی سطح تک پہنچنا لازمی ہے اور یہ ایک اہم تنقیدی حقیقت ہے جو میر کے گہرے فنی شعور پر دلالت کرتی ہے -

میر کے اس گہرے فنی شعور کا اظہار پوری طرح خود ان کے فن میں ہوا ہے---ان کے نظریات کی عملی شکل ان کی شاعری ہے جس میں یہ تمام خیالات و نظریات اپنی تمام باریکیوں کے ساتھ بے نقاب نظر آتے ہیں - ان کے اصل خط و خال کو میر کے اشعار ہی میں دیکھا جا سکتا

ہے ۔ میر کی بڑائی اس میں ہے کہ انھوں نے فنی شعور کے اظہار کو عملی شکل بھی دی ہے اور ایسی خوبی سے ان کو عملی طور پر برتا ہے کہ جس کی مثال کسی دوسری جگہ نہیں مل سکتی ۔ بلکہ بعض جگہ تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جو باتیں نظریاتی طور پر انھوں نے واضح نہیں کی تھیں ، ان کو بھی اپنے فن میں سمو دیا ہے ۔ اس سے اس خیال میں اور بھی استواری پیدا ہوتی ہے کہ ان کا فنی شعور لامحدود تھا ۔ اس کی پرواز بعض اوقات ایسے آسمانوں پر بھی ہوتی تھی جو بظاہر نظروں سے اوجھل ہوتے ہیں لیکن دور بین اور دور رس نگاہیں جنھیں دیکھ لیتی ہیں ۔ اور بعض اوقات تو وہ ایسی سرحدوں میں داخل ہو جاتا ہے جہاں پہنچنا کسی اور کے خواب و خیال میں بھی نہیں ہوتا ۔ یہ اشعار ان کے فنی شعور کی صحیح آئینہ داری کرتے ہیں :

بزم میں پوچھا تو یوں انجان ہو
میر ان لوگوں میں کس کا نام ہے

ہر چند میں نے شوق کو پنہاں کیا ولے
اک آدھ حرف پیار کا منہ سے نکل گیا

کیا وجہ کہوں خوں شدن دل کی پیارے
دیکھو تو ہو آئینے میں نم جنبشِ لب کو

چھپ لگ کے بام و در سے گلی کوچے میں سے میر
میں دیکھ لوں ہوں یار کو اک بار ہر طرح

صبح تک شمع سر کو دھنتی رہی
کیا پتنگے نے التماس کیا

پڑتے ہی نگہِ یار مرا حال ہے ویسا
بجلی کے تڑپنے سے کوئی جیسے کہ گر جائے

———

آوارگانِ عشق کا پوچھا جو میں نشاں
مشتِ غبار لے کے صبا نے اڑا دیا

———

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

———

کیا جانتے تھے ایسے دن آ جائیں گے شتاب
روتے گزرتیاں ہیں ہمیں راتیں ساریاں

گل نے ہزار رنگِ سخن سر کیا ولے
دل سے گئیں نہ باتیں تری پیاری پیاریاں

———

بھاتی ہے مجھے اک طلبِ بوسہ میں یہ آن
لکنت سے الجھ جا کے آگے بات نہ آئی

———

از خویشِ رفتہ ہر دم رہتے ہیں ہم جو اس بن
کہتے ہیں لوگ اکثر اس وقت تم کہاں ہو

———

مقدور تک تو ضبط کروں ہوں پہ کیا کروں
منہ سے نکل ہی جاتی ہے اک بات پیار کی

کیا جانوں چشمِ تر سے ادھر دل پہ کیا ہوا
کس کو خبر ہے میر سمندر کے پار کی

———

دور بہت بھاگو ہو ہم سے سیکھے طور غزالوں کا
وحشت کرنا شیوہ ہے کیا اچھی آنکھوں والوں کا

پیار کرنے کا جو خوباں ہم پہ رکھتے ہیں گناہ
ان سے بھی توچھئے تم اتنے کیوں پیارے ہوئے

مصائب لاکھ تھے پر جی کا جانا
عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے

جاتی ہے گزر جی پر اس وقت قیامت سی
یاد آوے ہے جب تیرا اک بارگی آ جانا

گل کی وفا بھی دیکھی، دیکھی جفائے بلبل
یک مشت پر پڑے تھے گلشن میں جائے بلبل

کم میری اور آنا، کم آنکھ کا ملانا
کرنے سے یہ ادائیں ہے مدعا کہ جا تو

آگے بھی تیرے عشق سے کھینچے تھے دور رنج
لیکن ہماری جان پہ ایسی بلا نہ تھی

گھبرا نہ میر عشق میں اس سہل زیست پر
جب بس چلا نہ کچھ تو مرے یار مر گئے

سرگرمِ جلوہ اس کو دیکھے کوئی سو جانے
طرزِ خرام کیا ہے حسن و جمال کیا ہے

ہزاروں ان نے کیں ایسی ادائیں
قیامت جیسے اس کی اک ادا ہے

طفلی کی ادا تیری جاتی نہیں یہ جی سے
ہم دیکھتے تجھ کو تو تو منہ کو چھپا جاتا

دل تڑپے ہے جان کھپے ہے حال جگر کا کیا ہوگا
مجنوں مجنوں لوگ کہیں ہیں مجنوں کیا ہم سا ہوگا

اقرار میں کہاں ہے انکار کی سی خوبی
ہوتا ہے شوق غالب اس کی نہیں نہیں پر

لعلِ خموش اپنے دیکھو ہو آرسی میں
پھر پوچھتے ہو ہنس کر مجھ بے نوا کی خواہش

طبیعت نے عجب کل یہ ادا کی
کہ ساری رات وحشت ہی رہا کی

کتنے دنوں میں آئی تھی اس کی شبِ وصال
باہم رہی لڑائی سو وہ رات بھی گئی

میر کے دیوان اس طرح کے اشعار سے بھرے پڑے ہیں ۔ یہ اشعار غزلوں کے اشعار ہیں ۔ غزلوں کے مقتضیات کو میر نے ان اشعار میں مجسم کر دیا ہے ۔ ان کے موضوعات نئے نہیں ہیں ۔ زندگی کی عام باتیں ہیں جن میں عمومیت اور آفاقیت اپنی جھلک دکھاتی ہے ۔ لیکن انسانی نفسیات کا گہرا شعور ان میں سے ہر ایک میں کام کرتا ہوا نظر آتا ہے ۔ پھر جس طرح ان کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے وہ میر ہی کا حصہ ہے ۔ ان میں حقیقت اور واقعیت ہے ، خلوص اور صداقت ہے ، سادگی اور صفائی ہے ، رمزیت اور ایمائیت ہے ، ربط اور توازن ہے ، نغمگی اور غنائیت ہے ــــ غرض وہ سب کچھ موجود ہے جو غزل اور تغزل میں ہونا چاہیے ۔ میر نے غزل کی روح کو ان میں سمو دیا ہے ــــ اور اسی میں ان کی بڑائی ہے ــــ اگر میر کے پاس گہرا فنی شعور نہ ہوتا تو ان کے فن میں یہ صورت حال پیدا نہیں ہو سکتی تھی ۔

اس گہرے فنی شعور نے میر کو صحیح معنوں میں میر بنایا ہے ۔ اسی کی بدولت ان کے فن میں زندگی پیدا ہوئی ہے ــــ زندگی جو صحیح معنوں میں فن کو فن بناتی ہے ــــ میر اسی زندگی کے مفکر فن کار ہیں ۔ ــــ زندگی اور فن کی اس ہم آہنگی نے انہیں ایک تحریک بنا دیا ہے ۔ ایک ادارے کی حیثیت دے دی ہے ۔ وہ سر بہ فلک پہاڑوں کا ایک ایسا عظیم سلسلہ معلوم ہوتے ہیں جو جغرافیائی اعتبار سے میدانوں پر کچھ ایسے اثرات چھوڑتا ہے کہ ان کی دنیا ہی بدل جاتی ہے ۔ اردو غزل پر انہوں نے کچھ ایسے ہی اثرات چھوڑے ہیں ۔

اور یہ سب کچھ ان کے گہرے فنی شعور ہی کا ایک کرشمہ ہے !

۷

میر کا تغزل

میر بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں ۔ انھوں نے ساری زندگی غزل سرائی کی ہے ۔ اس کے علاوہ ان کا کوئی اور مشغلہ نہیں رہا ہے ۔ وہ خود کہتے ہیں :

اور کچھ مشغلہ نہیں ہے ہمیں
گاہ بے گاہ غزل سرائی ہے

اور اس غزل سرائی میں ان کا کوئی ثانی نہیں ہے ۔ انھوں نے غزل کو غزل بنایا ہے ۔ اس کے حدود معین کیے ہیں ۔ اس کو آب و رنگ دیا ہے ۔ اس میں گرمی اور روشنی پیدا کی ہے ۔ اسی لیے زمین غزل ان کی ملک سی ہوگئی ہے ، اور یہ قطعہ بالکل ہی ان کے تصرف میں آ گیا ہے ۔ میر کو خود بھی اس کا احساس ہے ۔ چنانچہ انھوں نے اس کا اظہار بھی کیا ہے :

زمین غزل ملک سی ہوگئی
یہ قطعہ تصرف میں بالکل کیا

بظاہر یہ تعلی ہے لیکن اس میں بڑی صداقت اور حقیقت ہے اور اب میر کی مقبولیت کے پیش نظر اس صداقت اور حقیقت پر سب ہی ایمان لے آئے ہیں ۔

بات در حقیقت یہ ہے کہ میر غزل کی صنف کے ساتھ خاص مناسبت رکھتے ہیں ۔ میر کی زندگی عشق سے عبارت تھی اور غزل بھی عشق ہی کے ساتھ مخصوص ہے ۔ میر کے مزاج میں داخلیت اور دروں بینی تھی ۔ بے ربطی اور انتشار تھا ۔ غزل بھی انہیں باتوں کا تقاضا کرتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ میر اور غزل دونوں ایک دوسرے کے ساتھ کچھ اس طرح وابستہ ہوگئے ہیں کہ ایک کے ساتھ دوسرے کا خیال آنا یقینی ہے ۔ میر کے جوہر غزل کی صنف ہی میں کھلتے ہیں اور صنف غزل بھی میر ہی کے یہاں اپنے جوہر دکھاتی ہے ۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ میر اپنی ایک انفرادیت رکھتے ہیں ۔ ان کی شخصیت الگ پہچانی جاتی ہے ۔ اس میں تہہ داری ضرور ہے لیکن وہ نقاب پوش نہیں ہے ۔ وہ اپنے آپ کو چھپاتی نہیں لیکن صاف طور پر سامنے بھی نہیں آتی ۔ اس کا کنول آسانی سے نہیں کھلتا کلی سے پھول بننے میں اسے ذرا دیر لگتی ہے ۔ تھوڑا سا وقت درکار ہوتا ہے لیکن جب یہ پھول کھل جائے تو اس کے نظارے سے ہر ایک محظوظ ہو سکتا ہے ۔ اس کی خوشبو ہر طرف پھیل سکتی ہے ۔ وہ اپنے لیے اجنبی ہوں تو ہوں دوسرے کے لیے اجنبی نہیں رہتے ۔ بظاہر وہ دنیا سے دور اور زندگی سے بیزار نظر آتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ان دونوں سے بہت قریب ہیں ۔ اس دنیا اور زندگی سے الگ رہ کر ان کی انفرادیت نہیں ابھرتی ۔ وہ اس کے درمیان رہ کر ہی نمایاں ہوتے ہیں ۔ ان کی زندگی رشتوں سے عبارت ہے ۔ روابط کے بغیر اس کا کوئی تصور ہی نہیں ۔ اسی لیے میر کا تصور بھی تنہا پیدا نہیں ہوتا ۔ وہ اپنے ساتھ ایک پوری زندگی کو لاتا ہے ۔ اس کے ساتھ روابط اور رشتے آتے ہیں اور ان کو سامنے رکھ کر دیکھیے تو ایک نظام کی تصویر سامنے آتی ہے ، کچھ معیار اور اصول بنتے اور بگڑتے نظر آتے ہیں ، کچھ شخصیتیں چلتی پھرتی دکھائی

دیتی ہیں ۔ غرض میر کبھی تنہا نہیں دیکھے جاتے ۔ ان کے ساتھ ایک دنیا ہوتی ہے اور اسی لیے ان کی خلوت میں ایک انجمن کا احساس ہوتا ہے ۔ ان کو خود چاہے اس کا احساس نہ ہو لیکن دیکھنے والے اس کو ضرور محسوس کرتے ہیں ۔

میر کی زندگی اور ان کی غزل کا سب سے اہم پہلو عشق ہے ، لیکن اس عشق کی حیثیت خیالی نہیں ہے ۔ وہ خود ایک رابطہ ہے ۔ اس کا اپنا ایک نظام ہے ۔ اس کی اپنی ایک دنیا ہے ۔ اس کا اپنا ایک اخلاق ہے ۔ اس کی اپنی ایک تہذیب ہے ۔ اس میں وسعت اور بے پایانی کا پتہ چلتا ہے ۔ اس میں اتنی سادگی نہیں جتنی کہ بظاہر نظر آتی ہے ، نہ جانے کتنی چیزوں سے اس کا خمیر اٹھتا ہے ، نہ جانے کتنے عناصر اس کی تشکیل میں ممد و معاون ہوتے ہیں ۔ وحدت میں کثرت اور کثرت میں وحدت کو اگر دیکھنا ہو تو اس کی حقیقت میر کے اس عشق میں نظر آتی ہے جو ان کے ایک جذباتی ردعمل ہونے کی حیثیت سے بظاہر ان کی ایک انفرادی کیفیت ہے ، لیکن اس میں اس قدر عمومیت ہے اور آفاقیت کا رنگ و آہنگ ہے کہ وہ ہر انسان کا ردعمل معلوم ہوتا ہے ۔

(۲)

اس ردعمل کا سب سے بڑا محرک وہ احساس حسن اور ذوق جمال ہے جس کی میر کے یہاں فراوانی ہے ، لیکن جو دوسروں کے لیے بھی اجنبی اور نا مانوس نہیں ہے ۔ اس کی فراوانی سب میں مشترک ہے ۔ اس کا رچاؤ ہر ایک کے یہاں عام ہے ۔ میر کے اس احساس حسن اور ذوق جمال نے وہ طوفان اٹھایا ہے کہ ان کی زندگی ایک ہنگامہ بن گئی ہے ۔ ان کی غزل میں جو کچھ بھی ہے وہ سب اسی کے گرد گھومتا ہے ۔ انھوں نے جن واردات و کیفیات کو پیش کیا ہے ۔ جن معاملات کی ترجمانی کی ہے ، جن افکار و خیالات کو واضح کیا ہے ، جن تصورات و نظریات کی تشکیل کی ہے ، ان سب کا محور یہی احساس حسن اور ذوق جمال ہے ۔ یہ احساس اور ذوق نہ ہوتا تو ان کی زندگی ایک خلا

سے زیادہ حیثیت نہ رکھتی ۔ اس میں واقعات نہ ہوتے ۔ انھیں سانحات سے دوچار نہ ہونا پڑتا ۔ ان کے دل کو ٹھیس نہ لگتی ۔ ان کے جذبات میں بھونچال نہ آتا ۔ وہ مارے مارے نہ پھرتے ۔ انھیں در در کی خاک نہ چھاننی پڑتی ۔ آرزؤں اور تمناؤں کے جو رنگ محل انھوں نے تعمیر کیے تھے ، وہ زمین پر نہ آ رہتے ۔ جو باغ وہ لگانا چاہتے تھے اس میں خزاں نہ آتی ۔ میر نے جو عشق کیا ہے اور اپنی غزلوں میں جس کی ترجمانی کی ہے ، اس کا منبع ان کا یہی احساس حسن اور ذوق جمال ہے ۔

میر کو زندگی کی محرومیوں اور عشق کی ناکامیوں کا شاعر سمجھ لیا گیا ہے ، اور یہ بات ایسی کچھ غلط نہیں ہے ۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا بھی صحیح نہیں ہے کہ ان کے یہاں حسن محظوظ ہونے اور اس کی لذتوں سے سینہ بھر لینے کا خیال نہیں تھا ۔ ایسا نہیں ہے ۔ ان کی محرومیاں اور ناکامیاں درحقیقت اس حسن سے علیحدگی اور لذت سے دوری کی پیدا کردہ ہیں ۔ میر کے یہاں اسی لیے تو حسن کا خیال ایک طرح کی حسرت کے ساتھ وابستہ ہے ۔ اس کے ساتھ غم کے سائے ابھرتے ہیں ۔ حزن ویاس کی لہریں اٹھتی ہیں ۔ اسی لیے حسن ان کے یہاں گوشت پوست کا حسن نظر نہیں آتا ۔ اس کو دیکھ تو سکتے ہیں لیکن چھو نہیں سکتے، وہ گرفت میں نہیں آتا ، اُدھر ہی اُدھر منڈلاتا رہتا ہے ۔ میر کبھی بھی اس کے قریب نہیں ہوتے ۔ کسی وقت بھی انھیں اس سے کھلنے ملنے کا موقع نہیں ملتا ۔ برخلاف اس کے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ ساری زندگی اس کے پیچھے دوڑتے رہے ہیں ۔ لیکن وہ ان کی گرفت میں نہیں آ سکا ہے ۔ انھوں نے اس کے قریب ہونے اور اس کو حاصل کرنے کی کوشش کی ہے ۔ لیکن وہ ناکام رہے ہیں ۔ انھوں نے اس کے دامن کو پکڑنے کی کوشش کی ہے ۔ لیکن ہر بار اپنا ہی گریبان ان کے ہاتھوں میں آ گیا ہے ۔ اسی لیے میر کے یہاں احساس حسن کی شدت تو ہے ۔ لیکن اس کا تصور ہمیشہ ایک احساس محرومی کے ساتھ وابستہ رہا ہے ۔ انھوں نے اس کی ساری رنگینیوں اور رعنائیوں کو محسوس تو کیا ہے لیکن اس احساس میں ہمیشہ ایک حسرت کی کسک سی ضرور شامل رہی ہے ۔

ویسے میر نے اپنی غزلوں میں حسن کا جو تصور پیش کیا ہے وہ بڑا رنگین ، دلاویز اور لطیف ہے ۔ اس رنگینی ، دلاویزی اور لطافت کا احساس اس میں شدت سے ہوتا ہے ۔ لیکن چونکہ میر کی ذات اس کے ساتھ وابستہ نظر آتی ہے اس لیے اس کا تاثر خاطر خواہ نہیں ہوتا ۔ اس سے محظوظ اور لطف اندوز ہونے کو جی چاہتا ہے ۔ لیکن میر کا خیال جب بھی آتا ہے طبیعت ان کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے اور ان کے غم میں شریک ہو جانے کو جی چاہنے لگتا ہے اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ میر نے جس حسن کی ترجمانی کی ہے اُس میں خارجیت نہیں ہے ۔ برخلاف اس کے یہ اظہار میر کی داخلیت کا پابند ہے ۔ اسی لیے اس حسن کے ساتھ میر کا خیال اور میر کے ساتھ اس حسن کا خیال نہ آنا ناممکن سی بات ہے ۔

اور یہی بنیادی سبب ہے کہ میر کے یہاں حسن محض ایک فرد اور ایک ذات میں محدود ہے ۔ یہی ان کا محبوب ہے ۔ اسی محبوب کی ظاہری اور باطنی خصوصیات کو میر حسن سے تعبیر کرتے ہیں ۔ اس کی ذات سے باہر میر کے یہاں حسن کا کوئی تصور نہیں ہے ۔ میر صرف اسی کے حسن کو حسن سمجھتے ہیں ۔ اسی کا بیان ان کے پیش نظر رہتا ہے ۔ اگر کہیں انھوں نے کوئی عام بات بھی حسن کے بارے میں کہی ہے ، تو اس میں بھی ہمیشہ محبوب ہی کا حسن ان کے پیش نظر رہا ہے ۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ انھوں نے اپنے محبوب کے حسن میں اتنا مبالغہ کبھی نہیں کیا کہ وہ فرشتہ معلوم ہو ، اور اس کے حسن میں ماورائی خصوصیات پائی جائیں ۔ انھوں نے تو انھیں خصوصیات حسن کا بیان کیا ہے جو انسانوں میں پائی جا سکتی ہیں ۔ میر نے شاید اسی لیے زیادہ بڑھا چڑھا کر ان خصوصیات کو بیان بھی نہیں کیا ہے ۔ بلکہ جس طرح وہ اس سے متاثر ہوئے ہیں اس کی تفصیل پیش کی ہے ، اور اس سلسلے میں ناک نقشے ، رنگ روپ ، چال ڈھال ، عشوؤں اور اداؤں ، جسم و لباس ، غرض ہر چیز کے اثرات کو واضح کیا ہے ۔ اور اس طرح ان گنت ایسے اشعار کی تخلیق کی ہے جن میں خود جمال یار کی رنگینی اور رعنائی

جلوہ گر نظر آتی ہے ۔ یہ اشعار جمالِ یار کی رنگینیوں اور رعنائیوں سے کس درجہ بھرپور ہیں :

کیا رنگ میں شوخی ہے اس کے تن نازک کی
پیراہن اگر پہنے تو اس پہ بھی تہہ بیٹھے

کیا تن نازک ہے جاں کو بھی حسد جس تن پہ ہے
کیا بدن کا رنگ ہے تہہ جس کی پیراہن پہ ہے

مشہور چمن میں تری گل پیرہنی ہے
قربان ترے ہر عضو پہ نازک بدنی ہے

خورشید و قمر پیارے رہتے ہیں چھپے کوئی
رخساروں کو کو تو نے برقع سے چھپا رکھا

بلبل کی کف خاک بھی اب ہوگی پریشاں
جامے کا ترے رنگ ستمگر چمنی ہے

تمام اس کے قد میں سناں کی طرح ہے
رنگیلی نپٹ اس جواں کی ادا ہے

دلا بازی نہ کر ان گیسوؤں سے
نہیں آساں کھلانے سانپ کالے

ہمیں غش آگیا تھا وہ بدن دیکھ
بڑی کاول ٹلی ہے جان پر سے

منہ کھلے اس کے چاندنی چھٹکے
دوستو ! سیر ماہتاب کرو !

گوندھ کے گویا پتی گل کی وہ ترکیب بنائی ہے
رنگ بدن کا تب دیکھو جب چولی بھیگے پسینے میں

جیسے ہیں مونڈھے ، پھٹی ہے کہنی چسی ہے چولی پھنسی ہے مہری
قیامت اس کی ہے تنگ پوشی ہمارا جی تو بہ تنگ آیا

جب لگ گئے جھمکنے رخسار یار دیکھو
تب مہروماہ نے اپنی آنکھیں چھپالیاں ہیں

ان گل رخوں کی قامت لہکے ہے یوں ہوا میں
جس رنگ سے لچکتی پھولوں کی ڈالیاں ہیں

کیا سفیدی دیکھی اس کے آستین کے چاک سے
جس کے جھمکے رونہ تھا کچھ پرتو مہتاب میں

گذرا میں اس سلوک سے ، دیکھا نہ کر مجھے
برچھی سی لاگ جاہے جگر میں تری نگہ

بے تاب و تواں یوں میں کاہے کو تلف ہوتا
یاقوتی ترے لب کی ملتی تو سنبھل جاتا

اس سیم بدن کو تھی کب تاب تعب اتنی
وہ چاندنی میں شب کی ہوتا تو پگھل جاتا

آبِ حیات کی سی ہر اک روش ہے اس کی
پر جب وہ اٹھ چلے ہے اک آدہ مر رہے ہے

آگے تو رہیے اس کی طرز و رہ و روش سے
آنے میں اس کے لیکن کس کو خبر رہے ہے

اس کے چلنے کی آن کا بے حال
مدتوں میں بحال آتا ہے

بھاگنے پر بیٹھے تھے گویا غزال
تیری آنکھیں دیکھتے ہی رم چلے

چشم و ابرو ، ناز و خوبی زلف و کاکل ، خال و خط
دیکھیے کیا ہو بلائیں اتنی ہیں دل ایک ہے

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

رخسار اس کے ہائے رے جب دیکھتے ہیں
آتا ہے جی میں آنکھوں کو اس میں گڑوئیے

بندِ قبا کو خوباں جس وقت وا کریں گے
خمیازہ کش جو ہوں گے ملنے کو کیا کریں گے

یاد میں اس کے ساق سیمیں کے
دے دے ماروں ہوں ہاتھ رانوں پر

آگے یہ بے ادائیاں کب تھیں
ان دنوں تم بہت شریر ہوئے

تسلی ان نے نہ کی ایک رو سخن سے کبھو
جو کوئی بات کہی بھی تو آدھی لکنت سے

بھاتی ہے مجھے اک طلب بوسہ میں وہ آن
لکنت سے الجھ جا کے آہے بات نہ آئی

جب لے نقاب منہ پر تب دید کر کہ کیا کیا
در پردہ شوخیاں ہیں پھر بے محابیاں ہیں

سچ پوچھو تو کب ہوگا اس کا دہن غنچہ
تسکین کے لیے ہم نے اک بات بنائی ہے

واں آرسی ہے وہ ہے یاں سنگ ہے چھاتی ہے
گزرے ہے جو کچھ ہم پر سو اس کی بلا جانے

یہ اشعار حسن کی تصویریں ہیں اور جیسا کہ، ان سے ظاہر ہے، ان میں حسن نسوانی کے مختلف پہلوؤں کے حسن کی ترجمانی ہے - میر کی نظروں نے تن نازک، بدن کے رنگ، گل پیرہنی، حشر خرامی، طرز و رہ روش، چلنے کی آن اور خاص طور پر ٹھسک سے چلنے کی آن، چشم و ابرو، ناز و خوبی، زلف و کاکل، خال و خط، لب کی نازکی،

کجِ لب ، گوشہ چشم ، کان کے موتی ، بندِ قبا ، بے ادائیاں ، شوخی و شرارت ، زبان کی لکنت ، نقاب لینا ، آرسی میں منہ دیکھنا—— ان تمام پہلوؤں میں حسن نسوانی کی طرح داری کو دیکھا ہے ۔ انھوں نے ان سب کی پرستش کی ہے ۔ لیکن وہ ان سب کے گھائل ہیں ۔ یہ آخری شعر ان کی اس کیفیت کی صحیح ترجمانی کرتا ہے ۔ اس میں حسن سے محرومی کی کیفیت اپنی انتہا پر پہنچ جاتی ہے ۔ جب آرسی میں دیکھنے والے کے بالمقابل کوئی شخص سنگ اور چھاتی کے کاروبار میں مصروف نظر آتا ہے——

میر ان تمام اشعار میں حسن سے صرف اتنا ہی قریب ہوتے ہیں کہ اس پر سر دھنتے ہیں ۔ اس کی تعریفیں کرتے ہیں ۔ اس کو حاصل کرنے کی تمنا کرتے ہیں ۔ لیکن اس سے قربت حاصل کرنا انھیں نصیب نہیں ہوتا۔ اسی لیے ان کی حسرت ان کے ایسے اشعار میں نمایاں ہو جاتی ہے ۔ میر کی غزلوں میں اسی وجہ سے جہاں ، جہاں حسن کا بیان ملتا ہے ، وہاں اس سے دوری کا احساس ضرور کارفرما نظر آتا ہے ۔ ہاتھ ملنے کی سی کیفیت ضرور دکھائی دیتی ہے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ میر حسن کا بڑا رچا ہوا مذاق رکھتے ہیں ۔ اس سلسلے میں ان کی نگاہیں دور دور تک پہنچتی ہیں اور وہ ایسے پہلوؤں کو بھی ڈھونڈ نکالتے ہیں جن تک پہنچنا آسان نہیں ہوتا ۔ اس کے لیے حد درجہ رچے ہوئے ذوق جمال کی ضرورت ہوتی ہے ۔ میر کے ذوق اور احساس حسن میں غضب کا رچاؤ ہے ، بلا کی صحت مندی ہے ۔ وہ ایک بڑے تہذیب یافتہ انسان کا احساس حسن اور ذوق جمال معلوم ہوتا ہے ۔ میر کی غزلیں اس حسن کی ترجمانی سے بھری پڑی ہیں اور یہ ترجمانی ان کی عشقیہ شاعری کا ایک بہت ہی اہم پہلو ہے کیونکہ اس سے ان کے محبوب کی شخصیت کا پتہ چلتا ہے ۔ اس محبوب سے جو ان کے روابط ہیں ، ان سے شناسائی ہوتی ہے اور ان کے روابط کے نتیجے میں جس صورت حال سے وہ دوچار ہوتے ہیں ، اس کا اندازہ ہوتا ہے ۔

اسی لیے میر کی عشقیہ شاعری میں اس کی اہمیت اتنی زیادہ ہے ۔

(۳)

میر کی عشقیہ شاعری میں محبوب یوں بہت نمایاں نہیں ہوتا ۔ لیکن

اس میں شک نہیں کہ وہ اس سارے کارو بار میں بڑی فعال حیثیت رکھتا ہے۔ ویسے اس کے پوری طرح بے نقاب ہونے کی نوبت نہیں آتی۔ میر اس کو بے نقاب کرنا بھی نہیں چاہتے۔ کیونکہ ان کے معیار اس کی اجازت نہیں دیتے۔ اس کی جو اہمیت اس کی زندگی میں ہے اس کے زیرِ اثر وہ اسے بالواسطہ طور پر نمایاں کرنے کے لیے مجبور ہیں۔ چنانچہ میر کی عشقیہ شاعری میں اس محبوب کی شخصیت اور سیرت کی ایک پوری تصویر ابھرتی ہے۔ میر نے حسن کے بیان ہی میں اس کی بہت سی خصوصیات کو واضح کر دیا ہے لیکن اس کے علاوہ بھی اس میں بہت سی خوبیاں اور خامیاں ہیں۔ محبوب کی ان خوبیوں اور خامیوں نے میر پر گہرا اثر کیا ہے اور ان پر جو کچھ بھی بیتی ہے، جن حالات سے بھی انہیں دوچار ہونا پڑا ہے، اور اس کے نتیجے میں ان کا جو مزاج بنا ہے، اس میں محبوب کی شخصیت اور سیرت کے گہرے اثرات ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ میر کے یہاں جو کچھ بھی ہے اس میں محبوب کا ہاتھ کسی نہ کسی طرح ضرور کارفرما نظر آتا ہے۔ ویسے اس محبوب سے میر نے جسمانی اور مادی طور پر قربت نہیں حاصل کی ہے۔ وہ اس کے لیے کوشاں ضرور رہے ہیں۔ لیکن انہیں اس محبوب کو دیکھنا تک نصیب نہیں ہو سکا ہے۔ اسی لیے انہوں نے اس کے بارے میں جو باتیں کی ہیں ان میں خیال اور تخیل کا عنصر غالب ہے۔ میر نے صرف سوچا ہے کہ وہ ایسا ہے یا ایسا ہوسکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی یہ باتیں بڑی حد تک ان کی اپنی ذہنی اور جذباتی کیفیت کی پیداوار بن گئی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ جن خیالات کو انہوں نے محبوب کے بارے میں پیش کیا ہے، وہ خارجی طور پر اس میں نظر آنے کی بجائے ان کی اپنی داخلی کیفیت کا اظہار معلوم ہوتی ہیں۔ ان کی اپنی ذہنی کیفیت نے ان کو پیدا کر لیا ہے۔ ——بہرحال یہ خصوصیات اس اعتبار سے دلچسپ ہیں کہ ان سے ایک طرف تو محبوب کی شخصیت کے بعض نقوش ابھرتے ہیں اور دوسری طرف میر پر اس کا ردِ عمل بھی نظر آتا ہے۔ اس عمل اور ردِ عمل کی تفصیل میر کی عشقیہ شاعری میں پوری طرح موجود ہے۔

اس محبوب کی تصویر میر کی شاعری میں بڑی ہی حسین اور دلآویز

کج لب ، گوشہ چشم ، کان کے موتی ، بند قبا ، بے ادائیاں ، شوخی و شرارت ، زبان کی لکنت ، نقاب لینا ، آرسی میں منہ دیکھنا—— ان تمام پہلوؤں میں حسن نسوانی کی طرح داری کو دیکھا ہے ۔ انھوں نے ان سب کی پرستش کی ہے ۔ لیکن وہ ان سب کے گھائل ہیں ۔ یہ آخری شعر ان کی اس کیفیت کی صحیح ترجمانی کرتا ہے ۔ اس میں حسن سے محرومی کی کیفیت اپنی انتہا پر پہنچ جاتی ہے ۔ جب آرسی میں دیکھنے والے کے بالمقابل کوئی شخص سنگ اور چھاتی کے کاروبار میں مصروف نظر آتا ہے——

میر ان تمام اشعار میں حسن سے صرف اتنا ہی قریب ہوتے ہیں کہ اس پر سر دھنتے ہیں ۔ اس کی تعریفیں کرتے ہیں ۔ اس کو حاصل کرنے کی تمنا کرتے ہیں ۔ لیکن اس سے قربت حاصل کرنا انھیں نصیب نہیں ہوتا۔ اسی لیے ان کی حسرت ان کے ایسے اشعار میں نمایاں ہو جاتی ہے ۔ میر کی غزلوں میں اسی وجہ سے جہاں ، جہاں حسن کا بیان ملتا ہے ، وہاں اس سے دوری کا احساس ضرور کارفرما نظر آتا ہے ۔ ہاتھ ملنے کی سی کیفیت ضرور دکھائی دیتی ہے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ میر حسن کا بڑا رچا ہوا مذاق رکھتے ہیں ۔ اس سلسلے میں ان کی نگاہیں دور دور تک پہنچتی ہیں اور وہ ایسے پہلوؤں کو بھی ڈھونڈ نکالتے ہیں جن تک پہنچنا آسان نہیں ہوتا ۔ اس کے لیے حد درجہ رچے ہوئے ذوق جمال کی ضرورت ہوتی ہے ۔ میر کے ذوق اور احساس حسن میں غضب کا رچاؤ ہے ، بلا کی صحت مندی ہے ۔ وہ ایک بڑے تہذیب یافتہ انسان کا احساس حسن اور ذوق جمال معلوم ہوتا ہے ۔ میر کی غزلیں اس حسن کی ترجمانی سے بھری پڑی ہیں اور یہ ترجمانی ان کی عشقیہ شاعری کا ایک بہت ہی اہم پہلو ہے کیونکہ اس سے ان کے محبوب کی شخصیت کا پتہ چلتا ہے ۔ اس محبوب سے جو ان کے روابط ہیں ، ان سے شناسائی ہوتی ہے اور ان کے روابط کے نتیجے میں جس صورت حال سے وہ دوچار ہوتے ہیں ، اس کا اندازہ ہوتا ہے ۔

اسی لیے میر کی عشقیہ شاعری میں اس کی اہمیت اتنی زیادہ ہے۔

(۳)

میر کی عشقیہ شاعری میں محبوب یوں بہت نمایاں نہیں ہوتا ۔ لیکن

اس میں شک نہیں کہ وہ اس سارے کارو بار میں بڑی فعال حیثیت رکھتا ہے۔ ویسے اس کے پوری طرح بے نقاب ہونے کی نوبت نہیں آتی۔ میر اس کو بے نقاب کرنا بھی نہیں چاہتے۔ کیونکہ اُن کے معیار اس کی اجازت نہیں دیتے۔ اس کی جو اہمیت اس کی زندگی میں ہے اس کے زیرِ اثر وہ اسے بالواسطہ طور پر نمایاں کرنے کے لیے مجبور ہیں۔ چنانچہ میر کی عشقیہ شاعری میں اس محبوب کی شخصیت اور سیرت کی ایک پوری تصویر اُبھرتی ہے۔ میر نے حسن کے بیان ہی میں اس کی بہت سی خصوصیات کو واضح کر دیا ہے لیکن اس کے علاوہ بھی اس میں بہت سی خوبیاں اور خامیاں ہیں۔ محبوب کی ان خوبیوں اور خامیوں نے میر پر گہرا اثر کیا ہے اور ان پر جو کچھ بھی بیتی ہے، جن حالات سے بھی انہیں دوچار ہونا پڑا ہے، اور اس کے نتیجے میں ان کا جو مزاج بنا ہے، اس میں محبوب کی شخصیت اور سیرت کے گہرے اثرات ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ میر کے یہاں جو کچھ بھی ہے اس میں محبوب کا ہاتھ کسی نہ کسی طرح ضرور کارفرما نظر آتا ہے۔ ویسے اس محبوب سے میر نے جسمانی اور مادی طور پر قربت نہیں حاصل کی ہے۔ وہ اس کے لیے کوشاں ضرور رہے ہیں۔ لیکن انہیں اس محبوب کو دیکھنا تک نصیب نہیں ہو سکا ہے۔ اسی لیے انھوں نے اس کے بارے میں جو باتیں کی ہیں اُن میں خیال اور تخیل کا عنصر غالب ہے۔ میر نے صرف سوچا ہے کہ وہ ایسا ہے یا ایسا ہوسکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی یہ باتیں بڑی حد تک ان کی اپنی ذہنی اور جذباتی کیفیت کی پیداوار بن گئی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ جن خیالات کو انھوں نے محبوب کے بارے میں پیش کیا ہے، وہ خارجی طور پر اس میں نظر آنے کی بجائے ان کی اپنی داخلی کیفیت کا اظہار معلوم ہوتی ہیں۔ ان کی اپنی ذہنی کیفیت نے ان کو پیدا کر لیا ہے۔ —— بہرحال یہ خصوصیات اس اعتبار سے دلچسپ ہیں کہ ان سے ایک طرف تو محبوب کی شخصیت کے بعض نقوش ابھرتے ہیں اور دوسری طرف میر پر اس کا ردِ عمل بھی نظر آتا ہے۔ اس عمل اور ردِ عمل کی تفصیل میر کی عشقیہ شاعری میں پوری طرح موجود ہے۔

اس محبوب کی تصویر میر کی شاعری میں بڑی ہی حسین اور دلآویز

نظر آتی ہے ـــــ انھوں نے اس کو بڑی چابک دستی سے تیار کیا ہے ۔ ان کی تمثیل نے اس میں خاصی رنگینی پیدا کر دی ہے ۔ میر کی شاعری کا یہی ایک پہلو ہے جہاں رنگینی اور رعنائی کا پتہ چلتا ہے ورنہ تو ان کی ساری شاعری میں سلگنے والی کیفیت ہے ـــــ میر نے اپنے محبوب کو بلا کا حسین بنا کر پیش کیا ہے ۔ وہ اس کی شخصیت میں اللہ کی قدرت کا تماشہ دیکھتے ہیں ۔ لیکن اس کے لیے اس کا بے نقاب ہونا شرط ہے ۔ میر نے جب یہ کہا :

برقع کو اٹھا چہرے سے وہ بت اگر آوے
اللہ کی قدرت کا تماشا نظر آوے

تو نہ صرف اس کے حسن کی تعریف کی بلکہ اس خیال کا اظہار بھی کیا کہ اس کے حسن کو نظر آنا چاہیے ۔ وہ اس کو دیکھنے کے مشتاق ہیں ، کیونکہ اس کے حسن کی یہ کیفیت ہے کہ گویا اللہ نے اس کو اپنے ہاتھ سے بنایا ہے ۔ لیکن وہ بھلا کب نظر آتا ہے ، میر سوچتے رہتے ہیں کہ وہ جب نظر آئے گا تو کیسے کیسے ہنگامے برپا ہوں گے ۔ دنیا کی حسین سے حسین چیز کا حسن ماند پڑ جائے گا کیونکہ اس کے حسن کے سامنے دنیا کی کسی چیز کا حسن کوئی حقیقت نہیں رکھتا ۔ میر نے اسی لیے کہا ہے :

گل شرم سے بہہ جائے گا گلشن میں ہو کر آب سا
برقع سے گر نکلا کہیں چہرہ ترا مہتاب سا

جیسا کہ ان اشعار سے ظاہر ہے میر کا یہ محبوب برقع پوش اور پردے کی رسم کا پابند ہے کیونکہ جس معاشرے کا وہ فرد ہے اس میں اس پہلو کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے ۔ اسی لیے وہ میر کو نظر نہیں آتا ۔ مشکل ہی سے اس تک نظر پہنچتی ہے ۔ وہ میر سے بے نیاز ہے ۔ وہ ان کی طرف التفات نہیں کرتا بلکہ ان سے دور رہتا ہے ۔ اور اس کے نتیجے میں میر کو ظلم اٹھانے پڑتے ہیں :

سو ظلم اٹھانے کو کبھو دور سے دیکھا
ہرگز نہ ہوا یہ کہ ہمیں پاس بلا لے

وہ ان کو پاس کس طرح بلا سکتا ہے؟ اسے تو اپنی معاشرتی اور تہذیبی روایات کا خیال تھا۔ یہ روایات اسے اجازت ہی کب دیتی تھیں کہ وہ اُن کو دیدار کا موقع بہم پہنچائے۔ اسی لیے برسیں گزرنے کے بعد بھی ان کی آنکھیں میر سے دوچار نہیں ہوتیں حالانکہ وہ خود اس کی تاک میں رہتے ہیں:

برسوں تلک نہ آنکھ ملی ہم سے یار کی
پھر گو کہ ہم بہ صورت ظاہر اڑے رہے

اور جب یہ صورت حال پیدا ہوتی ہے تو میر کا ذہن محبوب کے خیال میں نہ جانے کہاں کہاں پہنچتا ہے، وہ نہ جانے کیا کیا سوچنے لگتے ہیں۔ ایسی باتیں جو ذہن میں نہیں آنی چاہییں، وہ بھی سامنے آ جاتی ہیں۔ کبھی انہیں اس کی بے وفائی کا خیال آتا ہے۔ کبھی اس کی شرارت سامنے آ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ کبھی وہ سوچنے لگتے ہیں کہ وہ بھلا کس سے آشنا ہوتا ہے۔ بے مروتی تو گویا اس کی گھٹی میں پڑی ہے۔ کبھی وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ ضرور وہ ان کا مذاق بناتا ہوگا۔ ضرور وہ ان کے فقروں کا ہدف بنتے ہوں گے۔ غرض اس طرح کے بیسیوں خیالات ہیں جو محبوب کا خیال آتے ہی میر کے ذہن پر منڈلانے لگتے ہیں۔ ان سب کو اُنھوں نے اپنے اشعار میں پیش کیا ہے:

اپنا شعار پوچھو تو مہربان وفا ہے
پر اس کے جی میں ہم سے کیا جانیے کہ کیا ہے

آگے یہ بے ادائیاں کب تھیں
ان دنوں تم بہت شریر ہوئے

اس سخن ناشنو سے کیا کہیے
غیر کی بات مان جاتا ہے

وے لطف کی نگاہیں پہلے فریب ہیں سب
کس سے وہ بے مروت پھر آشنا رہا ہے

بس ہو تو ادھر اودھر یوں پھرنے نہ دیں تجھ کو
ناچار ترے ہم یہ دیکھے ہیں چلن بیٹھے

پردہ ہم سے کر لیتے ہو جب آتے ہو مجلس میں
آنکھیں سب سے ملاتے ہو کچھ ہم ہی سے شرماتے ہو

غیریت کی اس کی شکایت یار عبث اب کرتے ہیں
طور اس شوخِ ستم پیشہ کا طفلی سے بے گانہ تھا

پشتِ پا پر ہے چشمِ شوخ اس کی
ہائے رے ہم سے ہے حجاب بہت

سب سے یگانگی کی جس کے لیے
وہ نہیں ہم سے آشنا افسوس

آنچل اس دامن کا ہاتھ آتا نہیں
میر دریا کا سا اس کا پھیر ہے

تھی یہ کہاں کی یاری آئینہ رو کہ تو نے
دیکھا جو میر کو تو بے ہیچ منہ بنایا

ہنس دے ہے دیکھتے ہی کیا خوب آدمی ہے
معشوق بھی ہمارا کیا خوب آدمی ہے

سہل وہ آشنا نہیں ہوتا
دیر میں کوئی اس کو یاد کرے

بہت نامہرباں رہتا ہے یعنی
ہمارے حال پر کچھ مہرباں ہے

اس کی بے گانہ وضعی ہے معلوم
برسوں تک آشنا رہا ہوں میں

وہی سمجھا نہ ورنہ ہم نے تو
زخم چھاتی کے سب دکھائے تھے

آتے ہو بعد صلح کبھی ناز سے تو یاں
منہ پھیر ادھر سے بیٹھے ہو جیسے لڑے ہوئے

اسی آرزو میں گئے ہم جہاں سے
نہ پوچھا کبھو لطف سے ٹک بلا کر

لطف و مہر و وفا وہ کیا جانے
ناز ہے خشم ہے عتاب ہے میاں

جب ہم کلام ہم سے ہوتا ہے پان کھا کر
کس رنگ سے کرے ہے باتیں چبا چبا کر

اک رنگ پان ہی اس کا دل خون کن جہاں ہے
پھبتا ہے اس کو کرنا باتیں چبا چبا کر

ہے رے بیگانگی کبھو ان نے
نہ کہا یہ کہ آشنا ہے یہ

ناز و انداز و ادا ، عشوۂ اغماض و حیا
آب و گل میں ترے سب کچھ ہے پہ پیار نہیں

ہنستے ہو روتے دیکھ کر ہم کو
چھیڑ رکھی ہے تم نے کیا ہم سے

خط مرا دیکھ دیکھ کہنے لگا
ہائے کیا کیا لکھے ہے نامہ سیاہ

کیا کریں نیچی نظر کرنے سے غصہ کھائے وہ
اور مجلس میں جو رہیے دیکھ تو شرمائے وہ

کیا عہدہ بر آئی ہو اس گل کی دو رنگی سے
ہر لحظہ ہے خود رائی ہر آن ہے رعنائی

یہ چند اشعار میر کے محبوب کی شخصیت کو ضرور پیش کر دیتے ہیں لیکن ان کو سامنے رکھ کر دیکھیے تو اس حقیقت کا ضرور اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں اس کی اصل تصویر نہیں ہے ۔ یہ تصویر تو میر کی بنائی ہوئی

تصویر ہے ، اور اس کو بنانے میں ان کی اس ذہنی کیفیت کا ہاتھ ہے جس سے پیچھا چھڑانا ان کے لیے مشکل تھا ۔ یہ اشعار اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ میر کو اس محبوب سے قربت حاصل نہیں ۔ وہ ان سے دور ہے اور اس دوری کے خیال ہی نے اس کو یہ شکل دے دی ہے کہ وہ میر کی طرف خاطر خواہ توجہ دیتا ہوا انہیں معلوم ہوتا ۔ حالانکہ یہ بھی میر کا محض خیال ہی ہے ، ورنہ یہ کیا ضروری ہے کہ محبوب محبت کرنے والے کے قریب ہو ہی جائے ۔ میر نے اس بات کو تسلیم کر لیا ہے کہ اس کے قریب لانے کی کوئی صورت نہیں ۔ یہ ایک ناممکن سی بات ہے ۔ اس لیے وہ محبوب کی شخصیت میں وہ تمام باتیں دیکھتے ہیں جن سے اُن کے خیال میں ان کی ذات کو ٹھیس لگتی ہے اور ان کو اپنا وجود ختم ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے ۔ ان حالات میں میر کے سامنے محبوب کی شخصیت کے ایسے پہلو زیادہ آتے ہیں جن میں پیار کے فقدان کا پتہ چلتا ہے ۔ کم از کم میر اسی طرح محسوس کرتے ہیں ۔ اور یہی سبب ہے کہ کہیں محبوب ان کا مذاق بناتا ہے ، کبھی ان کی خانہ خرابی پر ہنستا ہے ، کبھی خشم و عتاب کا اظہار کرتا ہے ۔ کبھی محفل میں آتا ہے تو منہ پھیر کر بیٹھتا ہے ۔ کبھی محبت کرنے والا محبت کی بات کرے تو وہ اس کو سننے کے لیے تیار نہیں ہوتا ، بیگانہ وضعی اس کی عادت بن جاتی ہے ، وہ شرارت پر بھی اُتر آتا ہے ۔ غرض وہ میر سے مطابقت پیدا نہیں کرتا اور میر اس پر کڑھتے رہتے ہیں ۔

بات درحقیقت یہ ہے کہ میر اپنے محبوب سے ایک والہانہ وابستگی رکھتے ہیں ، اور یہ والہانہ وابستگی ہی انہیں محبوب کے بارے میں اس قسم کے خیالات قائم کرنے کے لیے مجبور کرتی ہے ۔ جب لگاؤ اپنی انتہائی بلندیوں پر پہنچ جائے تو محبت کرنے والا محبوب کی طرف سے اس حد تک جذباتی ہو جاتا ہے کہ جو باتیں خارجی طور پر وجود نہیں رکھتیں ، اُن کو بھی اُس کا ذہن پیدا کر لیتا ہے اور ایسی باتیں بھی اسے نظر آنے لگتی ہیں جن سے محبوب دور کا بھی تعلق نہیں رکھتا ۔ میر کے ساتھ بھی یہی صورت پیش آئی ہے ۔ محبوب کے معاملے میں وہ بھی اسی نفسیاتی اُلجھن کے شکار ہیں ۔ اسی لیے وہ اس کو اپنا سمجھنے کے

باوجود اپنا نہیں بنا سکتے ۔ وہ انہیں دور بھاگتا ہوا معلوم ہوتا ہے ۔
کیا عمدہ شعر ہے :

دور بہت بھاگو ہو ہم سے سیکھے طور غزالوں کا
وحشت کرنا شیوہ ہے کچھ اچھی آنکھوں والوں کا

میر کے یہاں اس صورت حال کو درحقیقت ان حالات نے پیدا کیا ہے جن میں سے ہو کر وہ گزرے ہیں ۔ اس میں ان کے ذاتی اور انفرادی حالات کے ساتھ وہ سماجی اور سیاسی حالات بھی شامل ہیں جن کے سائے ہیں انھوں نے زندگی بسر کی ۔ ان حالات ہی کا سبب ہے کہ ان کا محبوب ان کی نظروں سے اوجھل رہنے کی کوشش کرتا ہے ۔ کیونکہ حالات درمیان میں حائل ہو جاتے ہیں اور جو کچھ میر چاہتے ہیں اس کو یہ حالات پورا نہیں ہونے دیتے ۔

ویسے اردو غزل کی روایت میں محبوب کا اس طرح رونما ہونا بڑی عام بات ہے ۔ لیکن فرق صرف یہ ہے کہ میر نے اس کو روایتی انداز میں پیش نہیں کیا ہے ، بلکہ واقعی جو کچھ ان پر بیتی ہے ، اس کو انھوں نے بیان کرنے کی کوشش کی ہے ۔ اور یہی سبب ہے کہ اس معاملے میں ان کے یہاں بڑی شدت ملتی ہے ۔ ان معاملات کی ترجمانی میں بڑے تنوع کا پتہ چلتا ہے ۔ بڑی ہمہ‌گیری نظر آتی ہے ۔ گہرائی اور گیرائی کا احساس ہوتا ہے اور جدت اور تنوع کے عناصر دکھائی دیتے ہیں ۔

اسی لیے عمومیت کے باوجود اس میں ان کی انفرادیت اپنی جھلک دکھاتی ہے اور اسی سے ان کا محبوب پہچانا جاتا ہے ۔ محبوب کے بیان میں ، اس کی اپنی خصوصیات سے زیادہ خود میر کی خصوصیات جو اتنی شدت سے نظر آتی ہیں ، وہ اس حقیقت کا کھلا ہوا ثبوت ہیں ۔

میر کی شاعری میں اس محبوب کی شخصیت اور اس کے مزاج کا رد عمل بہت نمایاں نظر آتا ہے ۔ اس محبوب سے انھیں محبت ہے ۔ وہ اس کے والہ و شیدا ہیں ۔ انھوں نے اس سے عشق کیا ہے ۔ اس لیے انھوں نے اس محبوب کو سامنے رکھ کر اس کیفیت کی ساری تفصیل اپنی غزلوں

میں سموئی ہے ۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ ان کی شاعری کا بیشتر حصہ اسی تفصیل پر مشتمل ہے ۔ اس تفصیل کے تحت وہ سب کچھ آ جاتا ہے جس سے وہ اپنی عشقیہ زندگی میں دو چار ہوئے ہیں ۔ لیکن اس میں بنیادی حیثیت اسی محرومی و ناکامی اور حسرت و یاس ہی کو حاصل ہے جس سے انہیں عمر بھر سابقہ رہا ہے ۔ محبوب کی طرف سے انہیں یہی چیز ملی ہے۔ عشق سے انہیں سوائے اس کے اور کچھ بھی حاصل نہیں ہوا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے جن معاملات کو پیش کیا ہے ، جن واردات و کیفیات کی ترجمانی کی ہے ، ان سب کا محور یہی ناکامی اور حسرت ہے ۔ اسی کے گرد ان کے تمام خیالات گھومتے ہیں ۔

میر اپنے محبوب کے پرستار ہیں ، اور یہی ان کا عشق ہے ۔ ان کا ایک لمحہ بھی اس پرستش کے خیال سے خالی نہیں رہا ہے ۔ اسی لیے وہ محبوب کے قریب جانے کی تمنا کرتے ہیں اور جب اس تک نہیں پہنچ پاتے تو ان پر ایک عجیب سا عالم طاری ہو جاتا ہے ، ایک عجیب سی کیفیت چھا جاتی ہے ۔ وہ مضطرب اور بےچین ہو جاتے ہیں ۔ محبوب کا خیال انہیں آرام سے نہیں بیٹھنے دیتا ۔ وہ اس کے متعلق سوچتے رہتے ہیں ۔ اُن کی تصویر ہر حال میں ان کی آنکھوں کے سامنے رہتی ہے ۔ رات کو یک بیک اس کا چہرۂ ماہتابی ان کی آنکھوں میں پھر جاتا ہے تو آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں ۔ اور یہاں پہنچ کر صرف رونے میں انہیں پناہ ملتی ہے :

یاد آوے ہے جب شب کو وہ چہرۂ مہتابی
آنسو مری پلکوں سے تارے سے چھٹکتے ہیں

اور اس طرح وہ راتیں رو رو کر گزار دیتے ہیں اور دن کو جوں توں شام کر دیتے ہیں اور یہاں کے سپید و سیاہ میں ان کو صرف اتنا ہی دخل رہ جاتا ہے ۔ ان پر بے بسی طاری ہو جاتی ہے اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ سوائے اس کے ان کا اور کوئی کام نہیں ۔ گویا اس صورت حال کے ساتھ وہ مطابقت پیدا کر لیتے ہیں :

یاں کے سپید و سیہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا اور دن کو جوں توں شام کیا

اور یہ مطابقت ہی انھیں زندہ رکھتی ہے ورنہ جن حالات سے انھیں دوچار ہونا پڑتا ہے ان میں زندہ رہنا آسان نہیں ۔ بہرحال وہ اس طرح جیتے ہیں ۔ لیکن حالت یہ ہو جاتی ہے کہ محبوب کا خیال ہر وقت ان کے پیش نظر رہتا ہے ۔ ان کا نام آتے ہی ان کی آنکھ بھر آتی ہے اور وہ یہ بھی سوچنے لگتے ہیں کہ اگر یہی حالت رہی تو زیست کس طرح ہوگی :

جب نام ترا لیجیے تب اشک بھر آوے
اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

لیکن انھیں جینا پڑتا ہے ، اور وہ جیتے ہیں لیکن مر مر کے ۔ چنانچہ زندگی ان کے لیے موت بن جاتی ہے ، اور وہ اسی طرح اس زندگی کو کاٹتے ہیں ۔ اس خیال کے ساتھ کہ نہ جانے یہ سلسلہ کب ختم ہوگا :

کٹے ہے دیکھیے یوں عمر کب تلک اپنی
کہ سنیے نام ترا اور چشم تر کرئیے

لیکن نام لینے اور نام سننے میں بات صرف اسی حد تک محدود نہیں ہے ۔ بلکہ اس کے ساتھ ملی جلی نہ جانے کتنی باتیں اور نہ جانے کتنے خیالات ذہن کے اُفق پر منڈلاتے ہیں اور نہ جانے کتنی تصویریں ابھرتی ہیں جن کا اثر کچھ ایسا ہوتا ہے کہ اسے محسوس ہی کر سکتے ہیں ۔

میر پر اپنے محبوب کا گہرا اثر ہے ، اور جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے ، وہ ایک لمحے کو بھی اسے فراموش نہیں کرتے ۔ اسی کی یاد میں وقت گزارتے ہیں ۔ یہ اثر ان پر اس قدر بڑھتا ہے کہ وہ اپنے آپ سے بے گانہ ہو جاتے ہیں اور از خویش رفتہ اور کھوئے کھوئے سے رہتے ہیں ۔ یہ حالت اس حد تک بڑھتی ہے کہ لوگ حیران ہوکر یہ پوچھنے لگتے ہیں کہ وہ اس وقت ہیں کہاں :

از خویش رفتہ ہر دم رہتے ہیں ہم جو اس بن
کہتے ہیں لوگ اکثر اس وقت تم کہاں ہو

گویا محبوب کی یاد میر کو اپنے آپ سے بیگانہ بنا دیتی ہے اور یہ کوئی

عجیب بات نہیں ہے ۔ جس شخص کا مقصد حیات ہی محبوب اور اس کی یاد ہو اس کے یہاں اس کیفیت کا پیدا ہونا یقینی ہے ۔

میر اسی طرح ہر وقت اپنے محبوب کی یاد میں کھوئے رہتے ہیں ، ان کے دل پر کچھ عجیب کیفیت گزرتی رہتی ہے ۔ بات بات پر کڑھنا ان کے مزاج میں داخل ہو جاتا ہے ، اور زندگی کا کوئی لمحہ بھی ایسا نہیں گزرتا جب وہ اس کو یاد کرکے آنکھوں میں آنسو نہ بھر لاتے ہوں :

چپکے سے آجاتے ہو آنکھیں بھر بھر لاتے ہو
میر گزرتی کیا ہے دل پر کڑھا کرو ہو اکثر تم

غرض انہیں چین نہیں ملتا اور ان کی زندگی اسی بے چینی کے عالم میں گزرتی ہے ۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ خود اپنے آپ سے بیزار ہو کو ہر لمحہ کڑھتے رہتے ہیں ۔

(۴)

یہ اور اسی قسم کی ان گنت کیفیات کو میر نے اپنی غزلوں میں پیش کیا ہے ۔ انہوں نے حسن کی پرستش کی ہے اور اس حسن کو انہوں نے اپنے محبوب میں دیکھا ہے ۔ انہوں نے اس سے ملنے اور اس کے قریب جانے کی کوشش کی ہے ۔ لیکن وہ اس کے قریب پہنچ نہیں سکے ہیں ۔ انہوں نے اس کے ساتھ نامہ و پیام کا سلسلہ جاری کیا ہے ۔ لیکن ان کی پذیرائی نہیں ہوئی ہے ۔ وہ نامہ بر کے ساتھ بھاگے ہیں ، قاصد کی انہوں نے منتیں کی ہیں ۔ لیکن ان سب باتوں کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا ہے ۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا ہے کہ وہ محبوب کی یاد میں اپنے آپ سے بیگانے ہوگئے ہیں ۔ ان پر وحشت کی سی حالت طاری ہوگئی ہے ، اس وحشت میں وہ صحرا صحرا جنگل جنگل مارے مارے پھرے ہیں ۔ دریا دریا رونے کو انہوں نے اپنا شعار بنا لیا ہے ۔ یہ وحشت زندگی بھر ان کے دم کے ساتھ رہتی ہے ۔ اس وحشت میں کبھی وہ محبوب کی طرف بھی جانکلتے ہیں ۔ لیکن وہ ان کی طرف بھلا کب متوجہ ہوتا ہے ؟ اس لیے وہ خوب

خوار ہوتے ہیں ۔ چنانچہ عزت سادات تک جاتی رہتی ہے ۔ وہ ساری زندگی محبوب کے وصل کی تمنا میں بسر کرتے ہیں ۔ لیکن وصل تو درکنا اس کا دیدار بھی انھیں مشکل سے نصیب ہوتا ہے ۔ وہ چھپ چھپ کے اس کو دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ کبھی وہ نظر آ بھی جاتا ہے لیکن ان کی طرف لطف کی نگاہ نہیں کرتا ۔ اس پر ان کا کوئی اثر نہیں ہوتا ۔ بام و دور سے لگے کھڑے رہتے ہیں اور حسرت سے تکتے رہتے ہیں ۔ کبھی اس عالم میں انھیں کچھ کھا کے سو رہنے کا خیال بھی آتا ہے اور وہ محبوب پر اس کو ظاہر بھی کرتے ہیں ۔ لیکن وہ مرتے نہیں ۔ پریشانیاں اٹھانے اور ظلم سہنے کے لیے انھیں زندہ رہنا پڑتا ہے اور پھر اسی زندگی میں انھیں عجیب عجیب تجربات ہوتے ہیں ۔ عجیب عجیب صورتیں پیش آتی ہیں ۔ اس کی تفصیل انھیں کی زبانی سنیے :

چھپ لگ کے بام دور سے گلی کوچے میں سے میر
میں دیکھ لوں ہوں یار کو اک بار ہر طرح

عہد کیے جاؤں ہوں اب کی آخر مجھ کو غیرت ہے
تو بھی منانے آوے گا تو ساتھ نہ تیرے جاؤں گا

تب تک ہی تحمل ہے جب تک نہیں آتا وہ
اس رستے نکلتا تو ہم سے نہ رہا جاتا

کبھو کچھ میر کی وحشت سے ان گلیوں کے آنے کی
خبر کیا پوچھتے ہو مجھ سے لڑکے اس دیوانے کی

حیرت سے عاشقی کی پوچھا تھا دوستوں نے
کہہ سکتے کچھ تو کہتے شرما کے رہ گئے ہم

جب کہا ہم میر سے عاشق ہو تم
ہو کے کچھ چپکے سے شرمائے بہت

میر جی راز عشق ہوگا فاش
چشم ہر لحظہ مت پر آب کرو !

بدنامی کیا عشق کی کہیے رسوائی سی رسوائی ہے
صحرا صحرا وحشت بھی تھی دنیا دنیا تہمت تھی

اس کا غضب سے نامہ نہ لکھنا تو سہل ہے
لوگوں کے پوچھنے کا کوئی کیا جواب دے

یاد اس کی اتنی خوب نہیں میر باز آ
نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا

گل نے ہزار رنگ سخن سر کیا ولے
دل سے گئیں نہ باتیں تری پیاری پیاریاں

گھر میں جی لگتا نہیں اس بن تو ہم ہو کر آداس
دور جاتے ہیں نکل ہجراں سے گھبرائے ہوئے

تھا جی میں اس سے ملیے تو کیا کیا نہ کہیے میر
پر کچھ کہا گیا نہ غم دل حیا سے آج

اقرار میں کہاں ہے انکار کی سی وہ خوبی
ہوتا ہے شوق غالب اس کی نہیں نہیں پر

طبیعت نے عجب کل یہ ادا کی
کہ ساری رات وحشت ہی رہا کی

ترے فراق میں کچھ کھا کے سو رہوں گا میں
تو کس خیال میں ہے تجھ کو کچھ خبر بھی ہے

رفتہ رفتہ اس پری کے عشق میں
میر سا دانا دوانا ہو گیا

وصل اس کا خدا نصیب کرے
میر جی چاہتا ہے کیا کیا کچھ

لیتے ہی نام اس کا سوتے سے چونک اٹھے ہو
ہے خیر میر صاحب کچھ تم نے خواب دیکھا

اس بزم خوش کے محرم ناآشنا ہیں سارے
کس سے کہوں کہ واں تک میری خبر کرو تم

آئے بن اس کے حال ہوا جائے ہے تغیر
کیا حال ہوگا پاس سے جب یار جائے گا

آئے ہیں میر منہ کو بنائے خفا سے آج
شاید بگڑ گئی ہے کچھ اس بے وفا سے آج

بہت سعی کیجیے تو مر رہیے میر
بس اپنا تو اتنا ہی مقدور ہے

کٹے ہے دیکھیے یوں عمر کب تلک اپنی
کہ نام سنیے ترا اور چشم تر کریے

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا
دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

یہ اشعار محض یادداشت کے سہارے بغیر کسی ترتیب کے نقل کیے گئے ہیں لیکن مجموعی طور پر یہ میر کی اس ذہنی اور جذباتی کیفیت کے پوری طرح سے ترجمان اور عکاس ہیں جس سے انہیں زندگی بھر دوچار رہنا پڑا ہے - یہ کیفیات و واردات ایسی کچھ عجیب نہیں ہیں - یہ ہر فرد پر طاری ہو سکتی ہیں اور اسی لیے ان میں ایک عمومیت اور آفاقیت کا احساس سب سے پہلے ہوتا ہے - ویسے میر کی انفرادیت اس میں ہر جگہ اپنی جھلک دکھاتی ہے - اس لیے یہ اشعار ان کی اپنی نفسیات کے بھی ترجمان ہیں لیکن ان کی نفسیات ایک عام انسان کی نفسیات سے الگ نہیں ہے - میر کا یہی کمال ہے کہ وہ عام انسانوں سے ماورا ہوتے ہوئے بھی ان سے الگ نہیں ہیں - ان میں سے ہر شعر کو پڑھنے کے بعد معاً اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ یہ میر کا شعر ہے کیونکہ یہ کیفیت صرف انہیں پر طاری ہو سکتی ہے لیکن اس کے ساتھ یہ خیال بھی آتا ہے کہ جو کیفیت میر پر طاری ہوئی ہے وہ خود اس پر اور دوسرے تمام انسانوں پر بھی طاری ہو سکتی ہے - یہ مخصوص کیفیات انسانوں کے لیے اور انسان ان مخصوص کیفیات کے لیے اجنبی نہیں ہیں -

اس میں شک نہیں کہ میر کے یہاں ان کیفیات و واردات میں انفعالیت کی ایک فضا ملتی ہے ۔ ناکامی اور محرومی کا ہاتھ یہاں بھی کام کرتا ہوا نظر آتا ہے ۔ لیکن میر کسی ایک جگہ بھی اپنی خودداری کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے ، غیرت مندی کا دامن کہیں بھی ان کے ہاتھ سے نہیں چھوٹتا بلکہ کسی جگہ تو یہ خودداری اور غیرت مندی اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ وہ محبوب سے یہ کہنے تک کو تیار ہو جاتے ہیں :

عہد کیے جاؤں ہوں اب کی آخر مجھ کو غیرت ہے
تو بھی منانے آوے گا تو ساتھ نہ تیرے جاؤں گا

یہ شعر میر ہی کہہ سکتے تھے ۔ غلطی سے اس شعر کو آن کی انانیت پر محمول کیا جا سکتا ہے لیکن اس میں انانیت نہیں ہے ۔ یہ تو انتہائے خلوص کا ترجمان ہے ۔ خلوص کی انتہائی بلندی کے بغیر اس قسم کے خیالات کا اظہار نہیں کیا جا سکتا ۔ میر کے یہاں واردات و کیفیاتِ عشق کی ترجمانی میں اس انداز کی کمی نہیں ہے ۔ محرومی اور ناکامی ہی نے اس کو پیدا کیا ہے ۔ خلوص کی انتہا کے بعد جب محرومی اور ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے تو عام طور پر دو صورتیں سامنے آتی ہیں ۔ ایک تو یہ کہ محبت کرنے والا اپنے محبوب سے روٹھنے لگتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ نہ صرف محبوب پر بلکہ سارے معاشرے پر ، تہذیب پر بلکہ ساری دنیا پر احسان کر رہا ہے اور دوسری صورت میں یہ ہوتا ہے کہ اس پر ایک ہمہ‌گیر آداسی چھا جاتی ہے اور اسی آداسی میں وہ پناہ لیتا ہے ۔ یہی اس کی سب سے بڑی مونس و غم خوار بن جاتی ہے ۔

میر کی غزلوں میں جہاں جہاں بھی واردات و کیفیاتِ عشق کی ترجمانی ہے وہاں اس صورت حال کا احساس ضرور ہوتا ہے ۔ کسی نہ کسی زاویے سے یہ ضرور اپنے آپ کو رونما کرتی ہے ۔

(۵)

اور یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ میر ایک سچے عاشق ہیں ۔ آنھوں نے بڑے پرخلوص طریقے پر عشق کیا ہے ۔ اس عشق کی ان کے

نزدیک بڑی اہمیت ہے ۔ انہوں نے محبوب کے ساتھ اس عشق کو بھی چاہا ہے ۔ وہ اس کے بھی دیوانے رہے ہیں ۔ اس کے لیے بھی انہوں نے نہ جانے کہاں کہاں کی خاک چھانی ہے ۔ یہ عشق ان کے لیے مقدس ہوگیا ہے ۔ انہوں نے اس میں عظمت دیکھی ہے ۔ انہیں اس میں وقار اور ترفع کے عناصر نظر آئے ہیں ۔ اسی لیے ایک منزل ان کی شاعری میں ایسی بھی آتی ہے جب وہ محبوب سے زیادہ عشق کے پرستار ہو جاتے ہیں ۔ یہی ان کا نصب العین بن جاتا ہے اور وہ اس کی شان میں رطب اللسان ہو جاتے ہیں ۔ اس کو سراہتے ہیں ، اس کے گن گاتے ہیں اور بالآخر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی ذات عشق میں اور عشق ان کی ذات میں مدغم ہو جاتا ہے ۔

میر نے اپنی شاعری میں اسی لیے تو عشق کا ایک واضح اور مکمل تصور پیش کیا ہے ، یہ تصور ان کی شخصیت کا آئینہ دار ، اُن کے عقائد و نظریات کا عکاس اور اُن کے معیار اور اقدار کا ترجمان ہے—— ان کے سارے افکار و خیالات کسی نہ کسی پہلو سے عشق کی اصلیت اور حقیقت پر روشنی ضرور ڈالتے ہیں اور عشق سے متعلق جو باتیں انہوں نے کی ہیں ان سے ان کے افکار و خیالات کی وضاحت ضرور ہوتی ہے ۔ میر کے یہاں یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں ۔ اور اس کا سبب یہ ہے کہ ان کے نزدیک زندگی عشق ہے اور عشق زندگی ۔

یہ بات عجیب نہیں ہے کہ میر اس زندگی کے انسان نہ ہوتے ہوئے بھی اس زندگی سے گہرا تعلق رکھتے تھے ۔ اس دنیا سے وابستگی نہ ہونے کے باوجود انہیں اس سے گہری وابستگی تھی۔ یوں انہیں تصوف سے بھی لگاؤ تھا لیکن اس نے بھی انہیں زندگی سے دور اور دنیا سے علیحدہ نہیں کیا ہے ۔ اسی لیے میر نے زندگی کو بڑی اہمیت دی ہے اور دنیا اور دنیاوی معاملات کو اس قدر نمایاں کر کے پیش کیا ہے ۔ ان کا عشق بھی اس زندگی اور دنیا سے الگ نہیں ہے ، وہ اسی سے تعلق رکھتا ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ میر کے نزدیک عشق کی حیثیت ماورائی اور مابعدالطبیعیاتی نہیں ہے ۔ اس لیے ان کے تصورِ عشق میں ایک نظام اخلاق ، ایک نظامِ معاشرت

اور ایک نظامِ تہذیب کی جھلکیاں نمایاں نظر آتی ہیں ۔ میر نے عشق کو زندگی کے ان پہلوؤں سے الگ کر کے نہیں دیکھا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کا عشق ان سب کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ نظر آتا ہے ۔

میر کے نزدیک عشق ایک آزمائش کا نام ہے ۔ اس سے عہدہ برآ ہونا آسان نہیں ۔ ایسا کرنے کے لیے تو جگر کو خون کرنا پڑتا ہے ۔ جان کی بازی لگانی پڑتی ہے ۔ قدم قدم پر خطرات کا سامنا کرنا پڑتا ہے ۔ ہر لمحے نئے نئے سانحے پیش آتے ہیں اور اس طرح نہ جانے کتنی منزلیں طے کرنے کے بعد وہ تکمیل سے ہم کنار ہوتا ہے ۔

میر کے خیال میں عشق کی راہ بڑی ہی کٹھن ہوتی ہے ۔ اس پر چلنا جان کی بازی لگانے کے مترادف ہے کیونکہ یہاں ہر گام پر ایک خطرگاہ ملتی ہے ۔ اسی لیے اس راہ پر چلنے والے کو سر سے گزر جانا چاہیے :

گزر سر سے تب عشق کی راہ چل
کہ ہر گام یاں اک خطرگاہ ہے

اور اس راہ پر جہاں ہر گام ایک خطرگاہ ہے جب کوئی قدم رکھ کر چلنا شروع کر دے تو نہ جانے کیا کیا کچھ پیش آتا ہے :

راہ دورِ عشق میں اب تو رکھا ہم نے قدم
رفتہ رفتہ پیش کیا آتا ہے بارے دیکھیے

لیکن خوف و خطر مسلکِ عشق کے خلاف ہے ۔ اس لیے یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس میں نہ جانے کن کن مصیبتوں سے دوچار ہونا پڑے گا ، ان کا خیال ہے کہ اس راہ میں قدم رکھنا چاہیے ۔ لیکن یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کسی کے پاس جان دینے کے لیے جگر موجود نہ ہو :

عشق میں نے خوف و خطر چاہیے
جان دینے کو جگر چاہیے

اگر ایسا ہو تو پھر عشق کی راہ میں قدم رکھنے والا مرتا نہیں ۔ عشق

اس کے لیے اعجاز بن جاتا ہے اور اس اعجازِ عشق کے سہارے اس کو زندگی نصیب ہوتی ہے :

اعجازِ عشق ہی سے جیتے رہے وگرنہ
کیا حوصلہ کہ جس میں آزار یہ سمائے

ویسے میر کے خیال میں جس کو عشق کا آزار لگ جائے وہ بڑی مشکل سے جیتا ہے ۔ اس کا علاج آسان نہیں ، یہ مرض ہے جو مرتے دم تک پیچھا نہیں چھوڑتا :

عشق کے داغ کا عبث ہے علاج
کوئی اب یہ نشان جاتا ہے

اسی لیے اُن کے خیال میں عشق کبھی بھی آبادی کا باعث نہیں بنتا ، تباہی اور بربادی اس کے ساتھ ساتھ چلتی ہے :

کشور عشق کو آباد نہ دیکھا ہم نے
ہر گلی کوچے میں اوجڑ پڑے تھے گھر کتنے

اور یہی سبب ہے کہ میر عشق کو محض مزہ ہی نہیں سمجھتے ۔ ان کے خیال میں وہ ایک بلا بھی ہے ۔ کیونکہ اس کی وجہ سے انسان کی ساری زندگی آزمائشوں میں گزر جاتی ہے اور اس کو ایسی ایسی پریشانیوں اور اُلجھنوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے جو زندگی کو موت بنا دیتی ہیں ۔ اور اگرچہ عشق میں مژدۂ وصال کا خیال بھی ہوتا ہے لیکن اس کو دوام نصیب نہیں ۔ اس کے ساتھ فراق کا ڈر برابر باقی رہتا ہے اور اکثر و بیشتر یہ عشق ہی میں تبدیل ہو جاتا ہے :

غمِ فراق ہے دنبالہ گردِ عیشِ وصال
فقط مزہ ہی نہیں عشق میں بلا بھی ہے

اور پھر عاشق کے یہاں سوز و درد و الم کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے ، جس کے ہاتھوں نہ صرف اسے تکلیف پہنچتی ہے بلکہ وہ زندگی میں

خوار و ذلیل اور رسوا بھی ہوتا ہے کیونکہ اس کو ایک جگہ پر قرار نہیں آتا اور وحشت میں مارے مارے پھرنا اس کا شعار بن جاتا ہے :

عشق نے خوار و ذلیل کیا ہم سر کو بکھیرے پھرتے ہیں
سوز و درد و داغ و الم سب جی کو گھیرے پھرتے ہیں

اور یہ صورتِ حال اس حد تک جا پہنچتی ہے کہ وہ عشق کے مفہوم کو بھی نہیں سمجھتا ، اس عالم میں تو بس اسے یہ محسوس ہوتا ہے جیسے سینے میں کوئی دل کو مل رہا ہے :

میں طور عشق سے تو واقف نہیں ہوں لیکن
سینے میں جیسے کوئی دل کو ملا کرے ہے

یا کوئی اندر ہی اندر جیسے دل کو کھائے جاتا ہے :

عشق و محبت کیا جانوں میں لیکن اتنا جانوں ہوں
اندر ہی اندر سینے میں مرے دل کو کوئی کھاتا ہے

لیکن عشق کرنے والا ان حالات سے مطابقت پیدا کر لیتا ہے اور اس کے لیے یہ باتیں نامانوس اور اجنبی نہیں رہتیں ۔ جب یہ منزل آ جاتی ہے تو اس میں خود اعتمادی پیدا ہو جاتی ہے ، اور وہ بھروسے کے ساتھ بات کرتا ہے ۔ کیونکہ یہاں پہنچ کر موت اس کے لیے ایک معمولی سی چیز بن جاتی ہے اور مرنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہو جاتا ہے :

گھبرا نہ میر عشق میں اس سہل زیست پر
جب بس چلا نہ کچھ تو مرے یار مر گئے

میر نے اس عشق کو فن عشق سے تعبیر کیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ وہ اس کو ایک فن ہی سمجھتے ہیں کیونکہ اس کو برتنے کے لیے ایک سلیقے کی ضرورت ہے ۔ ان کے خیال میں اس کے کچھ آداب ہیں ۔ اگر ان کا لحاظ رکھا جائے تو یقیناً عشق ایک فن کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے ۔

میر کے تصورِ عشق میں دو پہلو خاص طور پر ابھرتے ہیں۔ ایک تو اس کی ناکامی جس کے نتیجے میں رنج و غم کے ماحول کا پیدا ہونا یقینی ہے اور جس سے میر یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ عشق میں ہمیشہ ناکامیوں ہی سے کام رہتا ہے۔ وہ عشق ہی کیا جس میں وصل کی شاد کامیاں میسر آئیں، سرور و انبساط دور دورہ ہوا اور طربیہ اور نشاطیہ فضا کی گرم بازاری ہو۔ میر اسی لیے عشق کو حزن و یاس کا مترادف سمجھتے ہیں——اور دوسری بات اس کی بلندی اور ترفع کی خصوصیات ہیں جو ایثار اور قربانی، تقدس اور پاکیزگی کے ہاتھوں پیدا ہوتی ہیں۔ انھیں خصوصیات کے باعث وہ ایک اعجاز کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور حقیقت پر نظر رکھنے والے اسے ایک فن سمجھنے لگتے ہیں۔

یوں میر پر تصوف کے اثرات خاصے گہرے ہیں اور انھوں نے اپنے کلام میں جگہ جگہ عشق کا حقیقی تصور بھی پیش کیا ہے اور ایسے شعر بھی کہے ہیں:

کیا حقیقت کہوں کہ کیا ہے عشق
حق شناسوں کا ہاں خدا ہے عشق

لیکن ان کے کلام کو مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اس میں ان کا میلان دنیاوی عشق ہی کی طرف زیادہ نظر آتا ہے۔ کیونکہ جتنی باتیں بھی وہ کہتے ہیں، جتنے خیالات کا اظہار بھی کرتے ہیں، جتنے جذبات و احساسات کو بھی پیش کرتے ہیں، ان کی تان مادیت ہی پر ٹوٹتی ہے۔ بات یہ ہے کہ میر پر حقیقت سے کہیں زیادہ مجاز کا اثر تھا۔ تصوف کی دنیا سے کہیں زیادہ وہ اس دنیا کے انسان تھے اور جس عشق سے انھیں سابقہ پڑا وہ بھی اسی دنیا کا عشق تھا۔ اس لیے ان کے تصورات اور افکار و خیالات بھی اسی مجازی اور دنیاوی عشق سے تعلق رکھتے ہیں۔

(٦)

میر کی غزلوں میں وہ جو ایک حسرت نظر آتی ہے، وہ جو ایک درد

اور کسک کی سی کیفیت ملتی ہے ، وہ جو ایک المیہ فضا کا احساس ہوتا ہے اس کا سبب بھی یہی ہے کہ ان کا عشق اسی دنیا کا عشق ہے یہ عشق ناکام ہے ، اور یہ عشق ہمیشہ ناکام ہی ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر وہ کامیاب بھی ہو جائے تب بھی عشق کرنے والے کی ذہنی کیفیت کچھ ایسی ہو جاتی ہے کہ وہ اس کامیابی کو بھی ناکامی ہی سمجھتا ہے۔ ویسے خود میر کی شاعری میں اس کامیابی اور کامرانی کا کوئی تصور نہیں ۔ وہاں تو شروع سے آخر تک ناکامی ہی ناکامی ہے ، اور اسی صورت حال نے ان کے یہاں غم کو پیدا کیا ہے ۔ میر اسی غم کے سہارے جیتے ہیں ۔ اس غم کو انہوں نے عزیز بنا لیا ہے کیونکہ وہ بہرحال ان کے عشق کا دیا ہوا ہے جس کو وہ زندگی سمجھتے ہیں ۔ ان کے یہاں غم کی مختلف کیفیتیں ہیں ، اس کے مختلف پہلو ہیں، اس غم کے بغیر وہ کچھ بھی نہیں رہتے ۔ ان کی ہر بات غم میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہے ۔ ہر خیال سے غم ٹپکتا ہے ۔ اس غم سے متعلق کیسے کیسے عجیب شعر انہوں نے کہے ہیں :

یوں ہی حیران و خفا جوں غنچۂ تصویر ہوں
عمر گزری پر نہ جانا میں کہ کیوں دل گیر ہوں

سب کھلا باغِ جہاں الّا وہ حیران و خفا
جس کو دل سمجھے تھے ہم وہ غنچۂ تھا تصویر کا

میر صاحب رُلا گئے سب کو
کل وہ تشریف یاں بھی لائے تھے

جب رونے بیٹھتا ہوں تو کیا کسر رہے ہے
رومال دو دو دن تک جوں ابر تر رہے ہے

آہ معیشت روز و شب کی ساتھ اندوہ کے ٹھہری ہے
روتے کڑھتے رہا کرتے ہیں غم سے ہوئے ہیں خوگر غم

نمود کر کے وہیں بحرِ غم میں ڈوب گیا
کبھو تو میر بھی اک بلبلا تھا پانی کا

ہر گل زمیں یہاں کی رونے ہی کی جگہ تھی
مانند ابر ہر جا میں زار زار رویا

تو پاس نہیں ہوا تو روتے روتے
رہ رہ گئی ہے پہر پہر رات

سرہانے میر کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

آگ سی اک دل میں سلگے ہے کبھو بھڑکی جو میر
دے گی میری ہڈیوں کا ڈھیر جوں ایندھن جلا

ہم عشق میں نہ جانا غم ہی سدا رہے گا
دس دن جو ہے یہ مہلت سو یاں دبا رہے گا

طرفہ خیال کیا کرتا تھا عشق و جنوں میں روز و شب
روتے روتے ہنسنے لگا میر عجب دیوانہ تھا

سر مارنا پتھر سے اور ٹکڑے جگر کرنا
اس عشق کی وادی میں ہر نوع بسر کرنا

میں گریۂ خونیں کو روکے ہی رہا ورنہ
اک دم میں زمانے کا یاں رنگ بدل جاتا

قامت خمیدہ رنگ شکستہ بدن نزار
تیرا تو میر غم میں عجب حال ہوگیا

ان اشعار میں میر کے غم کی سچی اور صحیح تصویر ہے ۔ یہ غم عشق کا پیدا کیا ہوا ہے ۔ اس غم میں بڑی شدت ہے ۔ کیونکہ میر کا عشق بھی شدید ہے ۔ اس میں بڑی چبھن ہے ۔ بڑی نشتریت ہے ۔ لیکن یہ عجیب اور نامانوس نہیں ہے ۔ ان اشعار کو پڑھنے کے بعد اس کی شدت کا احساس تو ضرور ہوتا ہے جو اس غم میں ہے اور جس کے ترجمان یہ اشعار ہیں ۔ لیکن ساتھ ہی یہ غم ایک ہمدردی کے جذبے کو بھی بیدار کرتا ہے ۔ اسی لیے اس غم سے طبیعت گھبراتی نہیں ، اکتاہٹ اور بیزاری کا احساس پیدا نہیں ہوتا اور ہر لمحہ یہ خیال رہتا ہے کہ اس غم کی کیفیت صرف میر ہی پر نہیں بلکہ ہر فرد پر طاری ہو سکتی ہے ۔ اور انسانی زندگی کے لیے یہ غم اور اس غم کے لیے انسانی زندگی عجیب نہیں ہے ۔ بلکہ یہ دونوں اصل میں ایک ہیں ۔ یہی خصوصیات میر کے غم کو عظمت سے ہم کنار کرتی ہے ۔

لیکن میر کے عشق اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے غم میں نری جذباتیت نہیں ہے ۔ ان کا عشق بڑا باشعور عشق ہے ۔ میر ہر بات سلیقے سے کرنے کے قائل ہیں ۔ ان کے یہاں ہر خیال اپنی بنیاد رکھتا ہے ۔ ہر بات میں ایک نظم و ترتیب ہوتی ہے ۔ اسی لیے جو کچھ بھی انہوں نے اپنے عشق کے سلسلے میں کیا ہے ، اس کی زندگی میں ایک جگہ ہے ۔ وہ معاشرت اور تہذیب سے بھی الگ نہیں ہے ۔ میر نے اس پورے

پس منظر کے ساتھ اپنے عشق کی ساری تفصیل پیش کی ہے ۔ ان کا عشق ناکام ہے ۔ لیکن یہ ناکامی ایک وسیع پس منظر رکھتی ہے ۔ اس میں زمانے کی زبوں حالی اور حالات کی ناسازگاری بھی شامل ہے ۔ اگر معاشرتی حالات وہ نہ ہوتے جو میر کے تھے ۔ اگر زمانے کا وہ عالم نہ ہوتا جس میں نہ صرف میر بلکہ ہر فرد پریشان حال تھا تو شاید میر کو بھی اس ناکامی سے دوچار نہ ہونا پڑتا ۔ میر اس کا شعور رکھتے تھے ۔ اسی لیے انھوں نے اپنے عشق کی ناکامی اور اس کے غم کو سماجی اور تہذیبی شعور کے ساتھ پیش کیا ہے ۔ یہی سبب ہے کہ ان کی باتیں تمام تر جذباتی ، تخیلی اور رومانی نہیں ہیں بلکہ زندگی کی سنگین اور ٹھوس حقیقتوں سے گہرا تعلق رکھتی ہیں ۔ مثلاً محبت کی ناکامی اور محبوب کے بے وفا ہونے کا خیال ان کے یہاں اس عہد کے ساتھ آتا ہے ۔ جس میں یہ سب کچھ ہوا ہے :

اس عہد میں الٰہی محبت کو کیا ہوا
چھوڑا وفا کو ان نے مروت کو کیا ہوا

اور اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ عہد محبت کے لیے سازگار نہیں تھا ۔ حالات کچھ ایسے تھے کہ محبت ان کے سائے میں پنپ ہی نہیں سکتی تھی ۔ معاشرے اور تہذیب نے راستہ روک رکھا تھا ۔ معاشی اور اقتصادی مجبوریوں کے ہاتھوں محبت بے سہارا ہوگئی تھی ۔ محبوب تک نے وفا کو چھوڑ دیا تھا ۔ میر کے بیان میں یہاں حیرت ہے ۔ لیکن یہ حیرت تمام تر اس عہد اور اس عہد کے حالات پر ہے جو ان کے لیے عجیب تھے اور جنھوں نے ان کو کہیں کا بھی نہیں رکھا تھا ۔

میر کی غزلوں میں عام طور پر یہ باتیں اشاروں اور کنایوں میں ملتی ہیں ۔ لیکن کہیں کہیں ایسا بھی ہوا ہے کہ انھوں نے ان باتوں کو بہت واضح کر کے پیش کر دیا ہے ۔ مثلاً اس شعر میں :

زور و زر کچھ نہ تھا تو بارے میر
کس بھروسے پہ آشنائی کی

اس حقیقت کی براہ راست وضاحت ملتی ہے کہ ان کے زمانے کی بے زری اور مفلسی محبت کی سب سے بڑی دشمن تھی ۔ محبت کی تکمیل اور اس کو پروان چڑھانے کے لیے زور و زر کا ہونا بھی ضروری ہے کہ اس کے بغیر کامیابی اور کامرانی کا تصور ہی پیدا نہیں ہو سکتا ۔

بہ ظاہر میر کی شاعری کو دیکھ کر اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ عشق کی مصیبت ہی ان کے لیے سب سے بڑی مصیبت تھی ۔ لیکن ذرا غور سے دیکھا جائے تو اس میں نہ جانے کتنے مصائب اور نظر آتے ہیں جو غم جاناں سے زیادہ غم دوراں سے تعلق رکھتے ہیں ۔ اس ایک شعر میں انھوں نے اس کو پوری طرح واضح کر دیا ہے :

مصائب لاکھ تھے پر جی کا جانا
عجب اک سانحہ سا ہوگیا ہے

دوسرے مصائب کا اس میں شدید احساس ہے ۔ البتہ جی کا جانا ان کے لیے سب سے بڑا سانحہ ہے ۔ ہر چند کہ وہ عشق کے غم کو سب سے بڑا غم سمجھتے ہیں ۔ لیکن اس شعر سے یہ بھی صاف ظاہر ہے کہ دوسرے مصائب کو بھی وہ نظر انداز نہیں کرتے ۔ بلکہ غم عشق کے ساتھ ان مصائب کا خیال بھی انھیں ضرور آتا ہے ۔

غرض میر کے عشق میں نری جذباتیت نہیں ہے ۔ اس میں زندگی کا گہرا شعور ہے اور اس شعور کی نوعیت ، معاشرتی ، تہذیبی ، اقتصادی اور معاشی ہے—میر نے عشق و محبت کو زندگی کے ان پہلوؤں سے الگ کرکے نہیں دیکھا ہے ۔ بلکہ اسی پس منظر میں اس کی تفصیل پیش کی ہے ۔ اور اس صورت حال نے ان کی غزلوں میں گہرائی کو پیدا کیا ہے ۔

میر کی غزلوں کا عشقیہ پہلو اسی لیے حقیقت اور واقعیت سے ہم آہنگ نظر آتا ہے اور اس میں ہر پڑھنے والے کو اپنی تصویر دکھائی دیتی ہے ۔

۸

میر کی شاعری کا فکری پہلو

میر بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں ۔ تغزل ان کا خاص میدان ہے ۔ لیکن ان کی غزلیں صرف اسی پہلو تک محدود نہیں ہیں ۔ اس کے دوش بدوش ان کی غزلوں میں ایک اور پہلو بھی نمایاں ہوتا ہے جس کو ان کے فکری پہلو سے تعبیر کیا جا سکتا ہے ۔ اس کا منبع تصوف ہے جس کے زیر اثر انھوں نے اپنی غزلوں میں ایسے خیالات کی ترجمانی کی ہے جن کو فلسفے کے تحت رکھا جا سکتا ہے ۔ ان خیالات کو تصوف سے الگ کر لیا جائے تو ان کی کوئی حیثیت نہیں رہ جاتی ۔ تصوف ہی ان کی بنیاد ہے ۔

میر تصوف سے گہرا تعلق رکھتے ہیں ۔ انھیں ابتدا ہی سے تصوف کا ماحول ملا ، اور اسی کے سائے میں انھوں نے زندگی بسر کی ۔ اس ماحول کے اثرات ان پر ایسے گہرے ہوئے کہ تصوف کے معاملات و مسائل کو انھوں نے اپنے مزاج کا جز بنا لیا ، اور ان سب کی ترجمانی انھوں نے اپنی شاعری میں بھی کی ۔ چنانچہ تصوف کے بہت سے اسرار و

رموز ، ان کی غزلوں میں بے نقاب ہوئے ہیں ۔ لیکن اس سلسلے میں انہوں نے تصوف کی صرف اصولی باتوں ہی تک اپنے آپ کو محدود نہیں کیا ہے ۔ وہ اس کے اصول و نظریات ہی تک محدود نہیں ہوئے ہیں بلکہ تصوف کے توسط سے تو ان کے یہاں حیات و کائنات کے مختلف مسائل نے اپنی جگہ بنائی ہے—درحقیقت میر نے تصوف کو محض رسمی اور روایتی زاویہٗ نظر سے نہیں دیکھا ہے ۔ وہ تصوف کے تماشائی نہیں ہیں ۔ انہوں نے تصوف سے اپنی تہذیب کی ہے ۔ وہ اُن کے ذہن و فکر کو نکھارنے اور سنوارنے کا باعث بنا ہے ۔ تصوف کے ذریعے سے انہوں نے اپنی ذات کو پہچانا ہے ۔ انسان اور انسانیت کی حقیقت معلوم کی ہے ۔ زندگی اور زمانے کے اسرار و رموز اُن پر روشن ہوئے ہیں اور اس طرح تصوف نے انہیں فلسفے سے قریب کر دیا ہے ۔

یہ ٹھیک ہے کہ میر میں ایک فلسفی کی تمام خصوصیات نہیں ہیں ۔ کیونکہ شعور و ادراک سے کہیں زیادہ اُن پر احساس اور جذبے کا اثر ہے ۔ اسی لیے ان کی غزلوں میں غور و فکر کی کمی نظر آتی ہے ۔ لیکن ویسے وہ زندگی کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کرنے میں پیچھے نہیں رہتے—وہ زندگی کے ہر پہلو پر فلسفیانہ اظہار خیال کرتے ضرور ہیں ۔ لیکن اس میں احساس کی شدت اور جذبے کی فراوانی اس حد تک حاوی ہو جاتی ہے کہ یہ اظہار خیال میر کا ایک ذاتی اور انفرادی رد عمل سا بن جاتا ہے ۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ حقائق بہرحال ان کے یہاں رونما ہوتے ہیں ۔ ان حقائق کی نوعیت کہیں مابعد الطبیعاتی ہوتی ہے کہیں اخلاقی ، کہیں نفسیاتی ہوتی ہے اور کہیں عمرانی—میر نے زندگی کے ان پہلوؤں کو سامنے رکھ کر اپنی غزلوں میں ان گنت حقائق کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے ۔

(۲)

جہاں تک تصوف کا تعلق ہے ۔ میر اس کے اسرار و رموز کو پیش کرنے میں بہت زیادہ پیش پیش نہیں رہے ہیں ۔ انہوں نے اس خیال کا اظہار تو جگہ جگہ کیا ہے کہ یہ سارا عالم اور یہ کل کائنات

ذات باری کے مظہر ہیں ۔ ذرے ذرے میں اسی کا نور ہے ۔ ہر گل بوٹے میں اسی کا حسن ہے ۔ کائنات کے تمام مظاہر درحقیقت ایک پردہ ہیں ۔ جس کے پیچھے ایک ایسا حسن جلوہ فرما ہے جو لامحدود ہے ۔ زمانے کے گلشن میں اسی کا جلوۂ ہے اور اس جلوے نے گل پھول کو پردۂ سا بنا رکھا ہے :

جلوہ ہے اسی کا سب گلشن میں زمانے کے
گل پھول کو ہے آن نے پردہ سا بنا رکھا

چنانچہ آن کی نظرین ہر شے میں اسی حسن کو دیکھتی ہیں اور اسی نور کو تلاش کرتی ہیں ۔ انہیں خورشید کے حسن میں بھی اس ہی کا ذرہ نظر آتا ہے ۔ ہر نور کو وہ اسی حسن سے مستعار سمجھتے ہیں :

تھا مستعار حسن سے اس کے جو نور تھا
خورشید میں بھی اس ہی کا ذرۂ ظہور تھا

لیکن اس حسن کو دیکھنے اور اس نور سے منور ہونے کے لیے اپنی ذات میں چند صفات پیدا کرنے کی ضرورت ہے ، کہ ان کے بغیر یہ حسن اور یہ نور معدوم ہو جاتا ہے ۔ نگاہیں اس کو دیکھنے سے محروم رہتی ہیں ۔ میر نے کس قدر بلیغ انداز میں اس حقیقت کو واضح کیا ہے :

جو زمیں پا لغز ہے شاید کہ میر
ہے وہی مسجود اس کا آستاں

میر کے نزدیک لغزش ہی سب کچھ ہے ، جھومنے اور مست ہو جاتے ہی کو وہ بنیاد سمجھتے ہیں ۔ ان کے خیال میں اس کے بغیر انسان کو اس کا مقصد حاصل نہیں ہوتا—اور جب مقصد حاصل نہیں ہوتا تو اس کی تکمیل بھی نہیں ہوتی ۔

میر کے خیال میں اگر انسان میں یہ صفات موجود ہوں تو اس کی ذات ہی سب کچھ ہے—یوں تو وہ بے بس اور معذور ہے ۔ لیکن ان صفات کے ساتھ وہ قادر ہو جاتا ہے ۔ کیونکہ وہ سمجھنے لگتا ہے کہ اس

کا مقدور مقدور سے زیادہ ہے ۔

ہیں مشت خاک لیکن جو کچھ ہیں میر ہم ہیں
مقدور سے زیادہ مقدور ہے ہمارا

اور یہ سب کچھ اسی لیے ہے کہ انسان جس حسن کی تلاش اور جس نور کی جستجو میں ہے وہ خود اس کی اپنی ذات میں موجود ہے ۔ اگر وہ اس حقیقت کو نہ سمجھے تو اس میں خود اس کا قصور ہے :

تھا وہ تو رشک حور بہشتی ہمیں میں میر
سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنی قصور تھا

بات درحقیقت یہ ہے کہ میر بہت سے صوفیاء کی طرح وحدت‌الوجود کے قائل ہیں ۔ انھیں کائنات کی ہر چیز میں ذات باری کا جلوۂ نظر آتا ہے ۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ دنیا اسی جلوے سے رنگین ہے اور اس کائنات کا نظام اسی کے دم سے قائم ہے ۔ انسان اسی کی وجہ سے انسان ہے ۔ زندگی کی ہر شے میں جو نظم و ترتیب ہے اس کا سبب بھی یہی ہے—آن کے خیال میں انسان کا مقصد اس ذات سے لگاؤ ، اس کے حسن سے دلچسپی اور اس کے ساتھ وہ والہانہ نسبت ہے جس کو عشق حقیقی کہتے ہیں—چنانچہ ان کے کلام میں بےشمار ایسے اشعار ملتے ہیں جن میں اس عشق کی تفصیل کا پتہ چلتا ہے ۔ اس قسم کے اشعار کی ان کے یہاں کمی نہیں ہے :

درد ہے خود ہی ، خود دوا ہے عشق
شیخ کیا جانے تو کہ کیا ہے عشق

تو نہ ہووے تو نظم کل اٹھ جائے
سچ ہے یہ شاعراں خدا ہے عشق

———

قہر قیامت ، چاہت آفت ، فتنہ ، فساد ، بلا ہے عشق
عشق اللہ صیاد انھیں کہیو جن لوگوں نے کیا ہے عشق

عشق سے نظم کل ہے یعنی عشق کوئی ناظم ہے خوب
ہر شے یاں پیدا ہوئی ہے موزوں کو لایا ہے عشق

عشق ہے باطن اس ظاہر کا، ظاہر باطن عشق ہے سب
اودھر عشق ہے عالم بالا، ایدھر کو دنیا ہے عشق

دائر سائر ہے یہ جہاں میں تہاں متصرف ہے
عشق کہیں ہے دل میں پنہاں اور کہیں پیدا ہے عشق

موج زنی ہے میر فلک تک ہر لمحہ ہے طوفاں زا
سرتا سر ہے تلاطم جس کا وہ اعظم دریا ہے عشق

کیا حقیقت کہوں کہ کیا ہے عشق
حق شناسوں کا ہاں خدا ہے عشق

اور تدبیر کو نہیں کچھ دخل
عشق کے درد کی دوا ہے عشق

عشق سے جا نہیں کوئی خالی
دل سے لے عرش تک بھرا ہے عشق

کون مقصد کو عشق بن پہنچا
آرزو عشق مدعا ہے عشق

نزدیک عاشقوں کے زمین ہے قرار عشق
اور آسمان غبارِ سرِ رہگذارِ عشق

مقبول شہر ہی نہیں مجنوں ضعیف و زار
ہے وحشیانِ دشت میں بھی اعتبارِ عشق

گھر کیسے کیسے دین بزرگوں کے ہیں خراب
القصہ ہے خرابۂ کہنہ دیارِ عشق

ان اشعار سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں میر نے عشق کا حقیقی تصور پیش کیا ہے اور اس سے مراد ہے طریقت کے راستے سے ذات باری تک رسائی ۔ میر کے نزدیک یہی انسان کا نصب‌العین ہونا چاہیے کیونکہ کائنات کی ہر چیز اسی راہ پر گامزن ہے ۔ ہر شے اسی عشق سے سرشار ہے۔ دنیا میں ہر جگہ عشق ہی عشق ہے ۔ زمین سے لے کر آسمان تک اس عشق کی کارفرمائی ہے ۔ زمین قرارِ عشق ہے اور آسمان غبارِ رہگذار عشق ۔ اس عشق کی بلندی کا کوئی ٹھکانہ نہیں ۔ اس کی اہمیت کی کوئی انتہا نہیں ۔ کیونکہ اسی سے نظام عالم قائم و دائم ہے ۔ ہر چیز جو اس جہان میں پیدا ہوئی ہے ، اس کو عشق نے ایک موزوں شکل دے دی ہے اور اسی لیے ہر چیز پر اس کی حکمرانی ہے ۔

میر اس عشق کے قائل ہیں اور ظاہر ہے یہ ایک صوفی کا تصور عشق ہے ۔ اس تصور میں ان کے والد میر علی متقی کے ان خیالات کی گونج صاف سنائی دیتی ہے ، جن کو وہ میر کے کان میں ڈالتے رہے تھے ۔ میر نے ان باتوں کا اثر قبول کیا ہے اور ان کے نقوش ان کی شخصیت پر اتنے گہرے ہیں کہ وہ مجازی اور دنیاوی عشق کے ساتھ وابستہ رہنے کے باوجود ، عشق حقیقی کے متعلق اس قسم کے خیالات کو پیش کرنے کے لیے مجبور ہوگئے ہیں ، اور اس میں شک نہیں کہ وہ ان خیالات پر ایمان بھی رکھتے ہیں ۔

اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ میر کی طبیعت کا میلان تصوف کی طرف ہے ۔ وہ اس کو زندگی میں اہمیت بھی دیتے ہیں لیکن تصوف کی دنیا میں جتنی باتیں ہوتی ہیں ان سب کی مکمل تفصیل میر کے یہاں موجود نہیں ہے ۔ وہ تصوف کے تمام اصول و نظریات کو کھل کر پیش نہیں کرتے ۔ طریقت کے جو مدارج ہوتے ہیں اور اس راہ میں جو منزلیں آتی ہیں ۔ ان کا مکمل تذکرہ میر کے یہاں نہیں ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ خاصی جستجو اور تلاش کے بعد ان کے یہاں ایسے اشعار ملتے ہیں جن سے ان کے اصول و نظریات کی وضاحت ہوتی ہے۔ وہ بات جو ایک ڈوبے ہوئے صوفی شاعر میں ہونی چاہیے وہ میر کے یہاں نہیں ہے ۔ اور اس کا سبب یہ ہے کہ میر بنیادی طور پر دنیاوی معاملات کے شاعر ہیں ۔

لیکن اس کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ میر کو تصوف سے لگاؤ ہے۔ ان کا مزاج صوفیانہ ہے اور اسی لیے حیات و کائنات کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں ایک صوفی کا جو نقطۂ نظر ہونا چاہیے وہ میر کا بھی ہے ۔ زندگی اور انسانیت کے متعلق جو ایک سچا صوفی سوچتا ہے یا سوچ سکتا ہے ، اس کو میر بھی صحیح سمجھتے ہیں ۔ چنانچہ اس کی وضاحت ان کے کلام میں خاصی تفصیل سے ملتی ہے ۔

(۳)

ایک صوفی کے نزدیک مادی زندگی اہمیت نہیں رکھتی لیکن مادی زندگی میں جو کچھ ظہور پذیر ہوتا رہتا ہے اس سے دلچسپی نہ رکھنے کے باوجود وہ اس کو دیکھتا ضرور ہے ۔ اپنے گرد و پیش پر اس کی نظر ضرور ہوتی ہے ۔ وہ زندگی کے نشیب و فراز کو سمجھتا ضرور ہے ۔ انسانی زندگی اسے فانی نظر آتی ہے ۔ اس کے خیال میں وہ بے بنیاد اور ناپائدار ہے ۔ لیکن اس ناپائداری کے باوجود وہ زندگی کو اہمیت دیتا ہے ۔ اس کے نزدیک اس زندگی میں ایک مخصوص نظامِ اخلاق کا ہونا لازمی ہے ۔ اس اخلاق کی بنیاد محبت ، اخوت اور شرافت ہوتی ہے ۔ اسی لیے وہ انسانیت اور انسانی اقدار کو عزیز رکھتا ہے اور انہیں اقدار کی ترویج اس کے پیش نظر ہوتی ہے ۔

میر کے یہاں بھی اسی صورتِ حال کا احساس ہوتا ہے اور وہ بھی اپنی غزلوں میں ان تمام پہلوؤں پر اظہار خیال کرتے ہیں ۔ انھوں نے اپنے زمانے کے انتشار کو شدت کے ساتھ محسوس کیا ہے ۔ ان کی آنکھوں کے سامنے تباہی اور بربادی کے مناظر گزرے ہیں ۔ اسی لیے انھوں نے اپنے زمانے کی زبوں حالی پر خون کے آنسو بہائے ہیں ۔ اس پر شدید رنج و غم کا اظہار کیا ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ ان حالات نے اس نظامِ اقدار کی بنیادیں ہلا دی تھیں ۔ انسانوں کو پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا ، انسانی اقدار کی نفی کی تھی اور تہذیب و اخلاق کی جڑیں کھوکھلی کر دی تھیں ۔ میر کو اس کا بڑا غم ہے ۔ وہ اس پر بری طرح کڑھتے ہیں اور یہ خیال ایک لمحے کو بھی ان کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوتا ۔

انھوں نے اس موضوع پر براہ راست بھی اظہار خیال کیا ہے اور بالواسطہ بھی ۔ اور یہ اظہار خیال محض ایک تماشائی کا اظہار خیال نہیں ہے ۔ بلکہ ایک ایسے شخص کا اظہار خیال ہے جو خود ان حالات میں سے ہوکر گزرا ہے جس نے اس کے سائے میں زندگی بسر کی ہے ، اور جو ان پر ساری زندگی خون کے آنسو بہاتا رہا ہے ۔

دلی ان حالات کی آماجگاہ رہی ہے ، اس لیے میر نے اس کی تباہی کا تذکرہ اپنی غزلوں میں شد و مد سے کیا ہے :

اب خرابا ہوا جہان آباد
ورنہ ہر اک قدم پہ یاں گھر تھا

اب شہر ہر طرف سے میدان ہوگیا ہے
پھیلا تھا اس طرح کا کاہے کو یاں خرابا

اور یہ سب کچھ میر نے صرف اس لیے نہیں کہا کہ وہ خود دلی میں پریشاں حال تھے اور ان پر عرصہ حیات تنگ تھا بلکہ اس خیال کا اظہار اس لیے کیا کہ دلی میں رہنے والے انسان انھیں عزیز تھے ۔ اس شہر کی تہذیبی روایات انھیں عزیز تھیں ۔ کیونکہ ان روایات کا تعلق ان پریشاں حال انسانوں سے تھا جو دلی میں تباہ ہوئے اور جن میں خود میر بھی شامل تھے ۔ چنانچہ اس تباہی کو دیکھ کر انھیں اس کے ماضی کا خیال بھی آتا ہے اور وہ یہ بھی کہنے کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں :

جہاں اب خار زاریں ہوگئی ہیں
یہیں آگے بہاریں ہوگئی ہیں

اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ بہاریں انھیں عزیز تھیں کیونکہ ان کا تعلق انسانیت سے تھا ۔ ان بہاروں میں انسان خوش تھے ۔ ہر طرف اطمینان تھا ، فارغ البالی اور آسائش تھی ، اور ان کی وجہ سے انسان اچھی زندگی بسر کرتے تھے ۔ لیکن حالات کی تبدیلیوں نے یہ صورت حال پیدا کر دی

کہ ہر شخص پریشانیوں میں مبتلا نظر آنے لگا - ہر انسان کے سر سے موج خوں گزر گئی - عام انسانوں کا تو خیر پوچھنا ہی کیا ، شاہان وقت تک کا یہ حال ہوا :

شہاں کہ کحل جواہر تھی خاک پا جن کی
انہیں کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں

اور پھر حالت اس حد تک تباہ ہوئی کہ جو تاج و تخت رکھتے تھے انہیں روٹیوں کے لالے پڑ گئے ، اور بھیک تک کا ملنا دشوار ہوگیا :

دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انہیں
تھا کل تلک دماغ جنہیں تاج و تخت کا

امرا اور رؤساء فقیر ہوگئے اور ٹکڑے ٹکڑے پر جان دینے لگے :

کیا کہیے اپنے عہد میں جتنے امیر تھے
ٹکڑے پہ جان دیتے تھے سارے فقیر تھے

اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کو میر نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے -

لیکن میر کی بڑائی صرف اس بات میں نہیں ہے کہ انہوں نے اس زمانے کے حالات کو پیش کر دیا اور اس کی حقیقت بیان کر دی - ان کی بڑائی تو اس میں ہے کہ انہوں نے ان حالات سے کچھ نتائج نکالے اور اس طرح ان پر انسانی زندگی کے متعلق بعض ایسی حقیقتیں روشن ہوئیں جن کا اظہار انہوں نے انسانی زاویۂ نظر سے کیا -

اس سلسلے میں سب سے پہلے میر کی نظر انسانی زندگی کی اس حقیقت پر پڑتی ہے کہ وہ تغیر سے ہمکنار ہے اور ہر آن اس میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں :

حال گلزار زمانہ کا ہے جیسے کہ شفق
رنگ کچھ اور ہی ہوجائے ہے اک آن کے بیچ

اور پھر وہ یہ بھی نتیجہ نکالتے ہیں کہ اس زندگی سے سوائے کدورتوں کے کچھ حاصل نہیں ہوتا :

حاصل بجز کدورت اس خاک داں سے کیا ہے
خوش وہ کہ آٹھ گئے ہیں دامن جھٹک جھٹک کر

میر کے خیال میں یہ زمانہ تو ایک مقتل کی حیثیت رکھتا ہے :

دہر بھی میر طرفہ مقتل ہے
جو ہے سو کوئی دم کا فیصل ہے

یہاں کا قانون تو یہ ہے کہ خزاں انسان کو پانی کے بلبلے کی طرح سے مٹا دیتی ہے :

اس موج خیزدہر میں ہم کو خزاں نے آہ
پانی کے بلبلے کی طرح سے مٹا دیا

اس شعر میں میر نے ویسے انفرادی اور ذاتی کیفیت بیان کی ہے ۔ لیکن درحقیقت یہاں بھی وہ کہنا یہی چاہتے ہیں کہ زمانہ کبھی کسی کا ساتھ نہیں دیتا ۔ وہ تو انسانوں کو موت کے گھاٹ آتارتا رہتا ہے ، اور اس سے کسی کو کچھ حاصل نہیں ہوتا ۔ انسانوں کو بے بال و پر کر دینا ہی اس کا کام ہے ۔ سوائے اس کے وہ کچھ اور نہیں کرتا ۔ اس سے کسی اور بات کی توقع نہیں کی جا سکتی—یہ زندگی کی ایک اہم حقیقت ہے ۔ اسی لیے میر کے خیال میں اس پر حیران و پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ۔

رنگ اڑ چلا چمن میں گلوں کا تو کیا نسیم
ہم کو تو روزگار نے بے بال و پر کیا

اسی احساس کا نتیجہ ہے کہ میر اس زمانے سے بیزار ہیں ، انھیں اس میں کوئی خاص دلچسپی نظر نہیں آتی ۔ وہ اس سے دور بھاگتے ہیں اور آن پر یہ خیال مسلط ہو جاتا ہے :

یہ زمانہ نہیں ایسا کہ کوئی زیست کرے
چاہتے ہیں جو برا اپنا بھلا کرتے ہیں

اور میر کے یہاں یہ خیال اس حد تک شدت اختیار کرتا ہے کہ وہ زمانے سے علیحدگی اور زندگی سے بے نیازی کو انسان کے لیے ضروری سمجھتے ہیں - کیونکہ اسی میں انھیں انسانیت کی نجات نظر آتی ہے -

میر نے اپنے زمانے کے بارے میں جو کچھ کہا ہے ، اس سے جو نتائج نکالے ہیں اور ان کو سامنے رکھ کر زندگی کا جو لائحہ عمل پیش کیا ہے ، اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اس سلسلے میں ان کا نقطۂ نظر محض انفرادی اور ذاتی نہیں ہے - بلکہ اس میں ایک اجتماعی اور انسانی زاویۂ نظر کا پتہ چلتا ہے ، اور ایک آفاقی آہنگ کا احساس ہوتا ہے - ہر چند کہ اس نقطۂ نظر کو پیش کرنے میں میر کے یہاں جذبے کی شدت زیادہ ہے - اس لیے فکر کا عنصر ایسا کچھ زیادہ نمایاں نہیں ہوتا - لیکن اس کے باوجود اس میں سے حقیقتوں کے پیکر ابھرتے ہیں - میر کا یہ خیال کہ اس زمانے میں کوئی کیا زیست کر سکتا ہے - یہاں سوائے بے سروسانی اور بے بال و پری کے اور کوئی چیز حاصل نہیں ہوتی ، اس لئے اس سے بے نیاز ہو جانا ہی مناسب ہے - اگرچہ یہ ایک ایسا خیال ہے جس کی تان زندگی سے بیزاری اور فرار پر جاکر ٹوٹتی ہے - لیکن اس خیال میں جو صداقت ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا - ہر چند کہ میر نے اس خیال کی فلسفیانہ تحلیل نہیں کی ہے اور اس کو پیش کرنے میں فکر کی گہرائی سے بھی کام نہیں لیا ہے - لیکن ویسے ایک حقیقت کی وضاحت ضرور کی ہے—اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ بعض اوقات بڑے بڑے اس کو تسلیم کرنے کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں - خصوصاً وہ جن کی آنکھوں کے سامنے سے وہ سب کچھ گزرے جو میر کی آنکھوں کے سامنے گزرا تھا—اور پھر میر کی آنکھوں کے سامنے جو کچھ ہوا وہ اس کے خاموش تماشائی ہی نہیں تھے- وہ تو خود اس میں شریک تھے- ان پر تو وہ سب کچھ بیتی تھی - انھیں تو خود اس ساری زبوں حالی کا شکار ہونا پڑا تھا - اس لیے میر نے زمانے کے بارے میں جو نتائج نکالے ہیں—وہ ایسے کچھ غلط نہیں ہیں - ان کے حقیقت ہونے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں -

(۴)

یہ حقیقت یوں تو ہر اس شخص پر روشن ہو سکتی ہے جو ان حالات کا شکار ہو لیکن تصوف سے تعلق رکھنے والے کے لیے یہ حقیقت ایک نصب العین بن جاتی ہے - میر کے ساتھ یہی ہوا ہے - وہ تصوف پر ایمان رکھتے ہیں - صوفیوں اور درویشوں کا ان پر گہرا اثر ہے - اس لیے صوفیوں کی طرح اس مادی زندگی سے بے نیازی ہی ان کے نزدیک سب کچھ ہے - کیونکہ تمام صوفیوں کی طرح ان کے نزدیک بھی زندگی بے اعتبار ہے - کائنات کی ہر چیز فنا کے راستے پر گامزن ہے - یہاں ہر طرف موت کے سائے ناچ رہے ہیں - میر کی غزلوں میں نہایت شدت سے ان خیالات کا اظہار ہوا ہے - انھیں خیالات سے ان کے نقطۂ نظر کی تشکیل ہوتی ہے - انھیں سے ان کے فلسفۂ حیات کا ہیولا تیار ہوتا ہے - میر کی شاعری پر یہ خیالات چھائے ہوئے ہیں -

اس سلسلے میں سب سے پہلے جس خیال پر نظر پڑتی ہے وہ یہ ہے کہ کائنات میں تغیر کا عمل جاری ہے - زندگی میں حادثات کا عمل دخل ہے - ہر گھڑی یہاں ایک سانحہ ظہور پذیر ہوتا ہے - دیکھتے دیکھتے شاہان وقت فقیر ہو جاتے ہیں - تا جوری کا غرور خاک میں مل جاتا ہے - نوحہ گری اس کی قسمت میں لکھی ہوتی ہے اور اس شور سے کان ضرور دو چار ہوتے ہیں :

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاج وری کا
کل اس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا

اور یہاں کی کیفیت یہ ہے کہ آفاق کی اس منزل سے کوئی بھی صحیح سلامت نہیں جاتا - ہر شخص کی متاع یہاں لٹ جاتی ہے - سامان سفر تک سے وہ محروم رہتا ہے - بس یہی انسانی زندگی ہے اور انسان اس دنیا میں اسی قسم کا مسافر ہے :

آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت
اسباب لٹا راہ میں یاں ہر سفری کا

اسی لیے میر اس دنیا کو کارگہ شیشہ گری سمجھتے ہیں ۔ یہاں زندگی خرخشوں اور خدشوں سے خالی نہیں ۔ ہر آن دھڑکا سا لگا رہتا ہے ۔ چنانچہ اس راہ میں پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے ۔ یہی سبب ہے کہ میر اس کارگہ شیشہ گری میں سانس تک آہستہ لینے کی تاکید کرتے ہیں تاکہ اس کو کہیں ٹھیس نہ لگ جائے اور یہ سب کچھ چکنا چور ہو کر زمین پر نہ آ رہے :

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کے اس کارگہ شیشہ گری کا

یوں یہاں انسان کے بس میں خود کچھ بھی نہیں ۔ وہ میر کے خیال میں مجبور محض ہے ۔ لیکن پھر بھی اسے اس دنیا میں محتاط رہے بغیر چارہ نہیں ۔ زندہ رہنے اور زیست کرنے کے لیے اسے سنبھل کر چلنا ہوتا ہے ۔ میر ایک اور شعر میں اس خیال کی وضاحت کرتے ہیں :

ہردم قدم کو اپنے رکھ احتیاط سے یاں
یہ کارگاہ ساری دکان شیشہ گر ہے

غرض ان کے نزدیک یہ دنیا ایک آزمائش کی جگہ ہے اور انسان زندگی بھر انہیں آزمائشوں پر پورا اترنے کی کوشش کرتا رہتا ہے ۔ اس سلسلے میں بڑی ہی دشوار گزار منزلیں آتی ہیں ۔ میر کے نزدیک وہی انسان ہے جو ان سے بخیر و خوبی گزر جائے ، کہ انسانی زندگی بنیادی طور اسی بات کا تقاضا کرتی ہے اور انسان کا کام انہیں تقاضوں کو پورا کرنا ہوتا ہے ۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میر زندگی کے ساتھ دل لگانے کے قائل ہیں ۔ ان کے خیال میں تو یہ انسان کی سب سے بڑی غلطی ہے۔ کیونکہ انسانی زندگی اس بات کی شاہد ہے کہ اس زندگی نے انسان کو سوائے حسرت و ناکامی کے اور کچھ نہیں دیا ۔ اسی لیے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ انسان کو اس زندگی سے کوئی توقع نہیں رکھنی چاہیے ۔ ان کے خیال میں اس سے دل لگانا ایک مہمل اور لایعنی سی بات ہے۔ اس سے دلچسپی

لینا بے سود ہے ۔ کیونکہ اس سے کبھی کچھ حاصل نہیں ہوتا ۔ جب حوادث کے تھپیڑے اس کو ایک جگہ قائم ہی نہیں رہنے دیتے ، جب اسے خود کسی جگہ پر قرار نہیں ، تو بھلا وہ کسی کو دے کیا سکتی ہے اور کوئی اس سے حاصل کیا کر سکتا ہے ؟ یہی وجہ ہے کہ وہ اس دنیا میں تعمیر اور قصد تعمیر کے مخالف ہیں اور اس سے ہر شخص کو باز رکھنا چاہتے ہیں :

رہگذر سیل حوادث کا ہے بے بنیاد دہر
اس خرابے میں نہ کرنا قصد تم تعمیر کا

اسی خیال کو ایک شعر میں یوں ظاہر کیا ہے :

دنیا کی نہ کر تو خواستگاری
اس سے کبھو بہرہ ور نہ ہوگا

اور پھر اس خیال کی وضاحت کی ہے کہ دنیا میں تغیر کی حکمرانی ہے ۔ یہاں ہر آن رنگ بدلتا رہتا ہے ۔ اس لیے اسے صرف عیش کی جگہ تصور کر لینا غلطی ہے ۔ اس چمن میں تو ہر گل گویا خون سے بھرا ہوا ایک ساغر ہے :

یہ عیش گہ نہیں ہے یاں رنگ اور کچھ ہیں
ہر گل ہے اس چمن میں ساغر بھرا لہو کا

جب حقیقت حال یہ ہو تو ظاہر ہے کہ اس زندگی سے کوئی توقع نہیں کی جا سکتی ۔ اس کو لذت اور عیش کی جگہ نہیں سمجھا جا سکتا ۔ اس بات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ اس عالم میں چند لمحے اچھے بھی گزر سکتے ہیں ۔

میر کے خیال میں اگر کبھی کوئی ایسا وقت زندگی میں نصیب بھی ہوتا ہے تو اس کی حیثیت بالکل وقتی اور عارضی ہوتی ہے ۔ چشم زدن میں وہ گزر جاتا ہے ، اور یہ صورت حال اس لذت اور عیش کے لمحے کو دل میں داغ بنا کر چھوڑ دیتے ہیں ۔ مسرت کا حصول ان حالات میں

ناممکن ہے - اگر وہ کبھی زندگی میں رونما ہو بھی جائے تو اپنے ساتھ ہی درد و غم اور حزن و یاس کی فضا قائم کر دیتی ہے کیونکہ ہر گھڑی اس بات کا دھڑکا لگا رہتا ہے کہ بس اب یہ لمحہ ختم ہونے ہی والا ہے - اور حقیقت یہ ہے کہ وہ ختم ہو جاتا ہے ، گویا ختم ہونے کے لیے ہی اس کا وجود ہوا تھا - اس کی زندگی بہت تھوڑی ہوتی ہے - اس موضوع پر کیسے اچھے شعر میر نے نکالے ہیں :

یک نگاہ کو وفا نہ کی گویا
موسمِ گل صغیر بلبل تھا

خوب دریافت جو کیا ہم نے
وقت خوش میر نکہت گل تھا

''موسم گل'' یقیناً ''صغیر بلبل'' ہی ہوتا ہے - وہ ایک نگہ کو وفا نہیں کرتا - چھان پھٹک اور دریافت و جستجو کے بعد یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ وقت خوش کی حیثیت ''نکہت گل سے زیادہ نہیں ہوتی - جس طرح موسم گل ہمشیہ باقی رہنے کے لیے نہیں آتا ، جس طرح نکہت گل وقتی اور عارضی ہوتی ہے - اسی طرح انسانی زندگی میں مسرت بھی بس آنکھ جھپکاتے گزر جاتی ہے - انسان اس کے پیچھے دوڑتا ہے - اس کو پکڑنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ بھلا کس کے ہاتھ آتی ہیں -

میر اسی کو زندگی کا قانون سمجھتے ہیں - ان کے نزدیک یہی آئین حیات ہے - اس لیے وہ اس کے سامنے سپر ڈال دیتے ہیں - انسان کی شکست کا احساس آن پر چھا جاتا ہے—زندگی کے فنا ہو جانے کے خیالات آن پر مسلط ہو جاتے ہیں - ساری انسانی زندگی انہیں موت کی طرف دوڑتی ہوئی نظر آتی ہے اور وہ زندگی کو موت اور موت کو زندگی سمجھنے لگتے ہیں - یہی خیال آن کا عقیدہ بلکہ فلسفہ بن جاتا ہے - میر نے اس حقیقت کو نہ صرف تسلیم ہی کر لیا ہے ، اس کو واضح کرنے کی کوشش بھی کی ہے ، اور یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ موت ہی زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہے - میر کی غزلوں میں بے شمار اشعار ایسے ہیں جن سے اس

حقیقت پر روشنی پڑتی ہے - اُن کے خیالات کا نچوڑ ان اشعار میں موجود ہے :

اے تو کہ یاں سے عاقبت کار جائے گا
غافل نہ رہ کہ قافلہ اک بار جائے گا

یا قافلہ در قافلہ ان رستوں میں تھے لوگ
یا ایسے گئے یاں سے کہ کچھ کھوج نہ پایا

قافلے میں صبح کے اک شور ہے
یعنی غافل ہم چلے سوتا ہے کیا

ملا ہے خاک میں کس کس طرح کا عالم یاں
نکل کے شہر سے ٹک سیر کر مزاروں کی

موجیں کرے ہے بحر جہاں میں ابھی تو تو
جائے گا بعد مرگ کہ عالم حباب تھا

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

اس منزل جہاں کے باشندے رفتنی ہیں
ہر اک کے یاں سفر کا سامان ہو رہا ہے

عالم میں آب و گل کا ٹھہراؤ کس طرح ہو
گر خاک ہے اُڑے ہے اور آب ہے رواں ہے

بودِ آدم نمود شبنم ہے
ایک دو دم میں پھر ہوا یہ ہے

سیر کی ہم نے ہر کہیں پیارے
پھر جو دیکھا تو کچھ نہیں پیارے

یہاں میر نے صرف یہ اظہار ہی نہیں کر دیا ہے کہ زندگی پر موت کی حکمرانی ہے ، محض اس حقیقت کی وضاحت ہی نہیں کر دی ہے کہ یہ قافلہ فنا کی طرف جا رہا ہے - بلکہ زندگی کے مختلف مظاہر کو پیش کرکے اس حقیقت کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش بھی کی ہے - بود آدم کو نمود شبنم سے تعبیر کرنا محض عبارت آرائی نہیں ہے - اس خیال میں اس حقیقت کو واضح کرنا مقصود ہے کہ کس طرح شبنم کی مانند حیات انسانی بھی ایک دو دم میں ہوا ہو جاتی ہے - یہاں انسانی زندگی کے حسن اور لطافت کا احساس بھی ضرور دبا ہوا ہے - شبنم کے ساتھ اس کی مماثلت اس لطافت کو آنکھوں کے سامنے لا کر کھڑا کر دیتی ہے - لیکن اس کے ساتھ ہی یہ خیال بھی اُبھرتا ہے کہ جس طرح شبنم باقی رہنے والی نہیں ، اسی طرح انسانی زندگی بھی ناپائدار ہے - میر کا یہ اظہار زندگی میں فنا کے پورے عمل کی تصویر پیش کر دیتا ہے ، اور یہی ان کا مقصد ہے - دراصل وہ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ انسانی زندگی قطرے کی طرح غیر یقینی ہے - ڈانوا ڈول ہونا اس کے خمیر میں داخل ہوتا ہے اور یہ کہ چشم زدن میں وہ ہوا کی طرح اُڑ جاتی ہے - اس طرح ان کا یہ کہنا کہ عالم آب و گل میں ٹھہراؤ اور قرار ممکن نہیں کیونکہ یہاں خاک کا اُڑنا اور پانی کا بہنا اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ اس زندگی میں استواری نام کو بھی نہیں ہے - ہر شے یہاں ٹھہرنے کی بجائے کسی منزل کی طرف رواں دواں ہے اور ان کے خیال میں یہ منزل فنا کی منزل ہے - اسی طرح کلی کا تبسم بھی اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ گل کے ثبات کا خیال ایک بے کار سی بات ہے - وہ تو کھلتا ہی

اس لیے ہے کہ مرجھا جائے ۔ غرض کائنات کا نظام زندگی میں فنا کے عمل کو صحیح ثابت کرتا ہے ۔ اس نظام اور اس کے مختلف مظاہر کو سامنے رکھ کر میر اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ کوئی چیز یہاں باقی رہنے والی نہیں ہے زندگی انہیں ایک قافلہ نظر آتی ہے ۔ ہر طرف چل چلاؤ کی صدائیں سنائی دیتی ہیں ۔ قافلہ در قافلہ لوگ کسی طرف کو جاتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔ ہر باشندہ انہیں رفتنی معلوم ہوتا ہے ۔ ان کی نگاہیں ہر ایک کے سفر کا سامان ہوتے ہوئے دیکھتی ہیں اور ایک عالم انہیں خاک میں ملتا ہوا دکھائی دیتا ہے ۔

(۵)

حیات انسانی کو اس طرح دیکھنے اور اس کے بارے میں اس طرح سوچنے والے کو ہمیشہ زندگی ایک خواب نظر آتی ہے ۔ وہ ہمیشہ اس میں ایک نقش برآب کا سا عالم دیکھتا ہے ۔ اس کے نزدیک اس زندگی کی کوئی اساس نہیں ہوتی ۔ جو کچھ بھی اس زندگی میں ہے ، وہ اسے سراب سمجھتا ہے ۔ اُسے مادے میں حقیقت نظر نہیں آتی ۔ جو کچھ سامنے آتا ہے وہ اُس کو توہم جانتا ہے ۔ ہر شے کی حیثیت اس کے نزدیک ایک فریب کی سی ہوتی ہے ۔

میر بھی زندگی کو اسی زاویہ نظر سے دیکھتے ہیں ۔ دنیا کے بارے میں ان کے تصورات و نظریات یہی ہیں ۔ انہوں نے دنیا کو تمام تر ایک فریب سمجھا ہے ۔ ایک دھوکا جانا ہے ۔ ان کے خیال میں اس سے کبھی بھی کسی کو کچھ حاصل نہیں ہوتا ۔ تشنگی کا بجھنا تو درکنار یہاں تو ہونٹ بھی تر نہیں ہوتے :

دھوکا ہے تمام بحر دنیا
دیکھے گا کہ ہونٹھ تر نہ ہوگا

غفلت سے ہے غرور تجھے ورنہ ہے بھی کچھ
یاں وہ سماں ہے جیسے کہ دیکھے ہے کوئی خواب

کچھ نہیں بحر جہاں کی موج پر مت بھول میر
دور سے دریا نظر آتا ہے لیکن ہے سراب

غرض میر کے نزدیک دنیا ایک سراب ہے۔ زندگی ایک دھوکا ہے۔ اس کی اصلیت و حقیقت کچھ بھی نہیں۔ اس لیے وہ اس کو بے کار سمجھتے ہیں اور ان کے خیال کے مطابق اس دنیا سے دل لگانا یا اس سے فائدے کی توقع رکھنا نادانی ہے:

فکر تعمیر میں نہ رہ منعم
زندگانی کی کچھ بھی ہے بنیاد

رہگذر سیل حوادث کا ہے بے بنیاد دہر
اس خرابے میں نہ کرنا قصد تم تعمیر کا

اس لیے انسان کی فرزانگی کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اس زندگی کی حقیقت کو سمجھے اور اس سے منہ موڑے۔ اس حقیقت کا احساس کہ زندگی بے بنیاد ہے، اگرچہ انسان کو ہر وقت یاد رہتا ہے۔ لیکن بعض حالات میں وہ اس کو فراموش کرکے اسی زندگی کا حلقہ بگوش بھی ہوجاتا ہے۔ لیکن جلد ہی اس پر یہ حقیقت روشن ہوجاتی ہے کہ اس نے جو کچھ کیا غلط تھا اور جب موت قریب آتی ہے تو اس حقیقت کا راز اس پر کھلتا ہے کہ واقعی اس دنیا کی کوئی حقیقت نہیں۔ اس وقت کی حسرتیں اس حقیقت کا احساس دلاتی ہیں اور انسان کو اس حقیقت کا قائل ہونا ہی پڑتا ہے:

ٹک دیکھ آنکھیں کھول کے اس دم کی حسرتیں
جس دم یہ سوجھے گی کہ یہ عالم بھی خواب تھا

گویا میر اس حقیقت کو ذہن نشین بھی کراتے ہیں۔ اس کا درس بھی دیتے ہیں۔ ان لوگوں کے لیے جو اس حقیقت کا شعور نہیں رکھتے، اور اس شعور کے نہ ہونے کے باعث جن کی زندگی غلط راستوں پر گامزن

ہوتی ہے ۔ میر اس پچھتاوے کو اچھا نہیں سمجھتے ۔ جس سے آخر وقت میں ان لوگوں کو دوچار ہونا پڑتا ہے ۔ اس لیے وہ شروع ہی سے اس کی حسرتوں کو یاد دلاتے ہیں اور ان کی طرف متوجہ کرتے ہیں جو اس حقیقت کو سجھاتی ہیں کہ یہ دنیا خواب ہے ۔

میر زندگی کے اس انداز کو بخوبی سمجھتے ہیں ۔ اس کی بے ثباتی کے تمام پہلو اُن کے سامنے ہیں ۔ اس کی خرابی کا حال اُن پر روشن ہے ۔ یہ سب باتیں ان کے لیے عجیب ضرور ہیں ۔ لیکن چونکہ وہ حقیقت ہیں اس لیے انھیں حیرانی نہیں ہوتی ۔ کیونکہ یہ صورت حال تو زندگی میں اس وقت سے موجود ہے جس وقت سے اس زندگی کا سلسلہ شروع ہوا ہے ۔ اس لیے اس پر حیران ہونے کی ضرورت نہیں :

جب سے جہاں ہے تب سے خرابی یہی ہے میر
تم دیکھ کر زمانے کو حیران کیا رہے

گویا یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں ۔ اس دنیا میں زندگی کے ساتھ خرابی ہمیشہ سے وابستہ رہی ہے ۔ اس لیے وہ زندگی کے ہنگامے کو ''آشوب بحر مستی'' کہتے ہیں جس میں موج و حباب اُٹھ کر کنارے لگ جاتے ہیں ۔ یہ سلسلہ ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گا :

آشوب بحر ہستی کیا جانئے ہے کب سے
موج و حباب اُٹھ کر لگ جاتے ہیں کنارے

لیکن میر کو اس آشوب بحر ہستی کی تھاہ نہیں ملتی کیونکہ زندگی بذات خود ایک آشوب ہے اور اس آشوب کی وسعتوں کا کوئی ٹھکانا نہیں ۔ اس کی حیثیت تو ایک اتھاہ سمندر کی سی ہے ۔

حیات انسانی کی ان وسعتوں کا میر کو اندازہ ہے ۔ اس کی حقیقتوں کا سمجھنا ان کے نزدیک ضروری ہے ۔ کیونکہ جو شخص ان حقیقتوں کا شعور رکھتا ہے اس کو اس زندگی میں نئے نئے انکشافات ہوتے ہیں ۔ چھوٹی چھوٹی باتوں سے اہم حقیقتوں کا پتہ چلتا ہے ۔ اس لیے میر کی

نظریں اس زندگی میں ہر جگہ ایک جہان دیگر دیکھتی ہیں ۔ لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب انسان اس جہان سے سرسری نہ گزرے اور زندگی کے ہر پہلو کو غور سے دیکھے :

سرسری تم جہان سے گزرے
ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

میر ایسے ہی انسان کو صحیح معنوں میں انسان سمجھتے ہیں ۔ زندگی کو سمجھنا ، اس کے نشیب و فراز کا جاننا ، اس کی تہوں کا کھولنا ، اس کی گتھیوں کا سلجھانا جس کو آتا ہے اُسی کے ہاتھوں اس زندگی کے تقاضے پورے ہوتے ہیں ، اور جو شخص ان تقاضوں کو پورا کرتا ہے اُس میں عظمت کی شان پائی جاتی ہے ۔

(٦)

میر بنیادی طور پر انسان کی عظمت کے قائل ہیں ۔ ان کی غزلوں میں بھی انسان کی عظمت کا تصور بہت نمایاں ہے ۔ زندگی کے ہر شعبے میں انہوں نے انسان کو عظیم پایا ہے ۔ اُن کے خیال میں دنیا کا نظام اسی انسان کے دم سے قائم ہے ۔ اس میں جو روشنی نظر آتی ہے اور جس چمک دمک اور رونق کا احساس ہوتا ہے ، اس میں بھی انسان کا ہاتھ ہے ۔ دنیا کو دنیا اور زندگی کو زندگی بنانے میں انسان ہی نے سب کچھ کیا ہے ، اور آج زندگی کے اس آئینے پر جو جلا نظر آتی ہے اور جس کی وجہ سے وہ قابل دیدار ہوگیا ہے ، یہ سب کچھ بھی انسان ہی کا کیا دھرا ہے :

آدم خاکی سے عالم کو جلا ہے ورنہ
آئینہ تھا یہ ولے قابل دیدار نہ تھا

یہ شعر بظاہر ایک معمولی سا شعر ہے لیکن اس میں گہری معنویت ہے ۔ اس میں میر نے صرف اس خیال ہی کا اظہار نہیں کیا ہے کہ انسان عظیم ہے بلکہ زندگی کے ارتقائی عمل کی بھی وضاحت کی ہے ، اور انسان نے جس طرح اس ارتقائی عمل میں حصہ لیا ہے ، اس کو

بھی پیش کیا ہے - یہاں انسان کی عظمت آنھوں نے انسان کے اس عمل میں دیکھی ہے جو زندگی کے ارتقا میں ممد و معاون ہوا ہے ، اور جس کے باعث زندگی میں دل کشی پیدا ہوئی ہے -

لیکن میر صرف اسی وجہ سے انسان کو عظیم نہیں سمجھتے - ان کے خیال میں تو انسان کے عظیم ہونے کا باعث یہ بھی ہے کہ وہ ناسازگار حالات کو برداشت کرنے کی سکت اپنے اندر رکھتا ہے - برے سے برے حالات میں بھی اس کے قدم جمے رہتے ہیں - وہ اپنے اصول پر قائم رہتا ہے - زندگی کو برتنے اور بسر کرنے کی کوشش ہر حال میں اس کے یہاں جاری رہتی ہے - وہ بڑے بڑوں کی پرواہ نہیں کرتا - مشت خاک ہونے کے باوجود وہ آسمان تک سے ٹکر لینے کو تیار رہتا ہے :

یہ مشت خاک یعنی انسان ہی ہے رو کش
ورنہ آٹھائی کن نے اس آسمان کی ٹکر

کسی اور میں ایسا کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی - انسان ہی اس کی ہمت کرتا ہے - اس اعتبار سے دیکھا جائے تو انسان فرشتے سے بھی بڑا نظر آتا ہے - جہاں فرشتے کے پر جلتے ہیں وہاں بھی اس کی رسائی ہے - جس جگہ فرشتہ بھی کام نہ کر سکا وہاں بھی انسان کی آہ برچھیاں مارتی ہے اور اس طرح کامیابی کا سہرا اس کے سر رہتا ہے :

فرشتہ جہاں کام کرتا نہ تھا
مری آہ نے برچھیاں ماریاں

میر نے اس شعر میں اس حقیقت کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ انسان کے سامنے فرشتے کی بھی کوئی حیثیت نہیں - وہ فرشتے سے بھی زیادہ عظیم ہے - کیونکہ اس میں زندگی سے عہدہ برآ ہونے کی جو صلاحیتیں ہیں ، آن سے فرشتہ بھی محروم ہے - زندگی کا بوجھ انسان ہی نے آٹھایا ہے اور وہی اس کارخانے کو چلا رہا ہے ، حالانکہ وہ اس دنیا میں اپنی ناتوانی کے باعث مجبور محض ہے - اس کو کسی چیز پر

اختیار نہیں :

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

لیکن وہ اس جبر کے باوجود زندگی کی راہ پر آگے بڑھتا ہے اور کچھ نہ کچھ کرتے رہنے کی تمنا اس کے دل میں موجود رہتی ہے ۔ اس شمع کو وہ ہمیشہ اپنے دل میں فروزاں رکھتا ہے ۔

میر اس انسان کو عظیم سمجھتے ہیں ۔ لیکن ان کے خیال میں اس کی عظمت اس طرح قائم رہ سکتی ہے کہ وہ بعض اصولوں کو اپنے پیش نظر رکھے ۔ اس کے پاس زندگی بسر کرنے کے چند معیار ہوں ۔ اور وہ اصول و معیار یہ ہیں کہ انسان کو اس زندگی میں محبت ، خلوص اور صداقت سے رشتہ جوڑنا چاہیے ۔ انفرادی اور اجتماعی دونوں شعبوں میں جب تک انسان کے پیش نظر یہ بات نہیں رہے گی ، اس کو زندگی میں ، کامیابی اور کامرانی کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوگا—میر کی شاعری کا بیشتر حصہ انفرادی محبت کی اہمیت کو ظاہر کرتا ہے ۔ لیکن جگہ جگہ اجتماعی پہلو کی اہمیت بھی انہوں نے واضح کی ہے ۔ مذہب کو زندگی کی بنیاد نہ بنانا اور مذہبی تنگ نظری کی بجائے رندانہ کشادہ دلی کی اہمیت کو ذہن نشین کرانا اس خیال کو صحیح ثابت کرتا ہے کہ میر اسلام پر ایمان رکھتے تھے ۔ لیکن جہاں بھی اس حقیقت کو انہوں نے واضح کیا ہے وہاں اسلام کو خیر باد کہنے اور قشقہ کھینچ کر دیر میں بیٹھ جانے کو ترجیح دی ہے ۔ تسبیح کی جگہ زنار باندھنا انہیں زیادہ بھایا ہے :

میر کے دین و مذہب کو پوچھتے کیا ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

آئے ہیں میر کافر ہوکر خدا کے گھر میں
پیشانی پر ہے قشقہ زنار ہے کمر میں

ظاہر ہے میر کے ایسے اشعار میں قشقہ کھینچنے اور زنار باندھنے سے مراد یہ ہے کہ مذہبی تنگ نظری اچھی چیز نہیں ۔ اس سے تو کافر ہونا بہتر ہے ۔ بشرطیکہ اس کفر میں انسانی خصوصیات موجود ہوں اور وہ کسی طرح کا فساد نہ برپا کرتا ہو ۔ میر تو محبت کے بندے ہیں ۔ وہ انسانوں کے درمیان ، عقائد کے درمیان ، طبقوں کے درمیان ، قوموں کے درمیان محبت دیکھنے کے خواہشمند ہیں—ان کی رندی اور قلندری کی بنیاد بھی اسی خیال پر استوار ہے ، اور اس میں شبہ نہیں کہ محبت کی قدر جس طرح ان کی شاعری میں نمایاں ہے شاید ہی اردو شاعروں میں کسی اور کے یہاں اس طرح نمایاں ہوئی ہو !

محبت کی اس قدر ہی کا یہ اثر ہے کہ میر انسان کو خیر ہی خیر دیکھنا چاہتے ہیں ۔ شر سے انھیں کوئی لگاؤ نہیں ۔ کسی سے برائی کرنا تو ان کے نزدیک سب سے بڑا گناہ ہے ۔ اس لیے ان کا خیال ہے کہ چاہے انسان اس زندگی میں کچھ بھی کرتا رہے لیکن کسی کے ساتھ برائی نہ کرے، کسی کو تکلیف نہ پہنچائے ، کسی کے درپے آزار نہ ہو ۔ کیسی سادگی سے ایک شعر میں اس خیال کو پیش کیا ہے :

جی میں آوے سو کیجیو پیارے
ایک ہو جیو نہ درپے آزار

اس شعر میں لجاجت کا جو لہجہ ہے وہ میر کے شدت احساس پر دلالت کرتا ہے ۔ وہ کسی کی تکلیف کو برداشت کر ہی نہیں سکتے ۔ اسی لیے انسان کو درپے آزار ہونے سے روکتے ہیں ۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ لڑائی جھگڑے کے سخت خلاف ہیں ۔ ان کا نظریہ تو یہ ہے کہ اگر کوئی گالی بھی دے تو سن لینا چاہیے اور گالی دینے والے کے ساتھ بھلائی ہی کرنی چاہیے :

معیشت ہم فقیروں کی سی اخوان زماں سے کر
کوئی گالی بھی دے تو کہہ بھلا بھائی بھلا ہوگا

اس شعر سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ میر کا مسلک صلح کل ہے ۔

وہ غلط بات کو برداشت کرنے کے لیے تیار ہوتے ہیں لیکن ہنگامہ انھیں پسند نہیں ۔

برخلاف اس کے ان کا خیال تو یہ ہے کہ انسان کو ساری انسانی مخلوق کے ساتھ محبت کا برتاؤ کرنا چاہیے ۔ خدمتِ خلق کو وہ بہت اہمیت دیتے ہیں ۔ چنانچہ انھوں نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ اس خدمتِ خلق میں اپنے آپ کو پامال کر دینا ہی بہتر ہے :

بسانِ خاک ہو پامال راہِ خلق اے میر
رکھے ہے دل میں اگر قصد سرفرازی کا

اس قسم کے خیالات رکھنے والا ظلم کو کسی حال میں بھی برداشت نہیں کر سکتا ۔ میر بھی ظلم و استعداد کے دشمن ہیں ۔ کیونکہ اس سے محبت اور نیکی کی نفی ہوتی ہے ۔ اسی لیے وہ منعموں کے بھی سخت خلاف ہیں کیونکہ ان کی دولت کی بنیاد ظلم پر ہوتی ہے ، اور ایسی دولت کو جمع کرنا میر کے نزدیک لاحاصل ہے کیونکہ اس دنیا میں وہ ہمیشہ اس دولت سے فائدہ حاصل نہیں کر سکتا ۔ موت اس کے سامنے کھڑی رہتی ہے اور ایک وقت اس کی زندگی میں بھی ضرور ایسا آتا ہے جب وہ دولت اس کے لیے بے کار ہو جاتی ہے ۔ یہ وقت وہی ہوتا ہے جب موت کے سامنے اس کی کچھ پیش نہیں جاتی :

منعم نے بنا ظلم کی رکھ گھر تو بنایا
پر آپ کوئی رات ہی مہمان رہے گا

میر یہاں کہنا یہ چاہتے ہیں کہ ظلم کرنے والے کو کبھی سکونِ قلب حاصل نہیں ہوتا ۔ ایک دن اس کو بھی موت آتی ہے ، وہ بھی فنا ہو جاتا ہے ۔ موت کے ساتھ اس کی دولت بھی ختم ہو جاتی ہے ، اور اس کو اس دنیا سے بہر صورت خالی ہاتھ ہی جانا ہوتا ہے ۔

اس سلسلے میں میر نے ایک اور بات بڑے پتے کی کہی ہے ۔ وہ یہ کہ انسان کو اپنی زبان غنچے کی طرح ذہن میں رکھنی چاہیے اور دنیا کے

اس چمن میں بندھی مٹھی کی طرح جانا چاہیے ۔ کیسا عمدہ شعر ہے !

زباں رکھ غنچہ ساں اپنے دہن میں
بندھی مٹھی چلا جا اس چمن میں

اور اس سے میر کی مراد صرف یہ ہے کہ انسان کو بردباری اور وقار کے ساتھ زندگی بسر کرنی چاہیے ۔ اپنی شخصیت کو منتشر کرنا اس کے لیے مناسب نہیں ۔ اس کے لیے ضروری تو یہ بات ہے کہ وہ اپنی شخصیت کی تنظیم کرے اور رکھ رکھاؤ سے کام لے ، کہ اسی میں اس کی بڑائی کا راز ہے ۔

غرض زندگی کو بسر کرنے اور انسان کو انسانیت سے ہم کنار کرنے کے لیے میر کے یہی موٹے موٹے اصول ہیں ۔ انھیں اصولوں سے ان کے نظام اخلاق کی تشکیل ہوتی ہے ۔ یہ نظامِ اخلاق ان کی شاعری پر محیط ہے اور اس کی ایک لہر سی ان کی غزلوں میں دوڑی ہوئی نظر آتی ہے ۔

(۷)

اس بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ میر کی غزلوں میں حیات و کائنات کے معاملات و مسائل کی کمی نہیں ہے ۔ انھوں نے ان سب پر طبع آزمائی کی ہے ۔ مابعدالطبیعاتی نکات ، عمرانی معاملات ، اخلاقی مسائل ، غرض زندگی کے ہر پہلو کی ترجمانی ان کے یہاں ملتی ہے اور انھیں پہلوؤں کی ترجمانی سے ان کی غزلوں میں فکری عناصر جگہ پاتے ہیں ۔ اور اس طرح میر کے یہاں فلسفیانہ پہلو نمایاں ہوتا ہے ۔

ویسے میر میں ایک فلسفی کی تمام خصوصیات نہیں ہیں ۔ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ طبعاً جذباتی ہیں ۔ اس لیے فلسفیانہ خیال ان کے یہاں کسی انفرادی کیفیت کا روپ اختیار کر لیتا ہے اور یہ صورت حال فکری پہلو کو پس منظر میں ڈال دیتی ہے ۔ فلسفہ اس صورتِ حال کے ساتھ وجود اختیار نہیں کرتا ۔ اس لیے، جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا گیا ، میر کی غزلوں

میں فلسفے سے زیادہ تصوف کی حکمرانی نظر آتی ہے ۔ ان کے خیالات فلسفیانہ سے زیادہ متصوفانہ ہیں ۔ ظاہر ہے ان میں احساس اور جذبے کو زیادہ نمایاں ہونا چاہیے ۔ چنانچہ ان کے فکری پہلو کے اظہار میں احساس اور جذبے کی فراوانی ہے ۔ اس لیے ان کے یہاں فلسفیانہ خیالات تو پیدا ہوتے ہیں ، فکری پہلو بھی ابھرتا ہے لیکن اس کا آہنگ فکری اور فلسفیانہ نہیں رہتا۔۔۔اسی لیے ان کے پیش کیے ہوئے خیالات فلسفیانہ معلوم بھی نہیں ہوتے ۔ برخلاف اس کے ان کے خیالات محض ایک انفرادی ، جذباتی اور احساساتی ردِ عمل معلوم ہوتے ہیں جن کو میر کا شدید تاثر پیدا کرتا ہے ۔ البتہ اس کی تہہ میں فکری پہلوؤں کی کارفرمائی نظر ضرور آتی ہے ، اور ان فکری پہلوؤں میں اجتماعیت اور آفاقیت کا احساس ضرور ہوتا ہے ۔

میر تصوف کے فلسفی نہیں ہیں ۔ انھوں نے تصوف سے رشتہ ضرور جوڑا ہے ، اس کو اپنی فکر کی بنیاد ضرور بنایا ہے ۔ لیکن تصوف کے اصول و نظریات پیش نہیں کیے ہیں اور ان کی فلسفیانہ تحلیل نہیں کی ہے ۔ ان کے یہاں تو تصوف انسان کے لیے ایک اصول اور لائحہ عمل ہے جو انسانیت سکھاتا ہے ۔ اس کے ذریعے سے ان باتوں کی وضاحت ہوتی ہے کہ انسان کو کیا سوچنا چاہیے ، اس کے کیا عقائد ہونے چاہییں ، اس کو کس طرح زیست کرنی چاہیے اور اس کے نزدیک زندگی کا مقصد اور انجام کیا ہونا چاہیے ۔ میر کی غزلوں میں ان سب کا جواب ملتا ہے اور خاصی تفصیل سے ملتا ہے ۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ تصوف کو بنیاد بنا کر میر نے مابعدالطبیعیات ، اخلاقیات ، عمرانیات اور نفسیات کے مختلف معاملات و مسائل پر اظہار خیال کیا ہے اور اس سلسلے میں بڑے پتے کی باتیں کہی ہیں ۔ ان باتوں کی بنیاد حقیقت اور واقعیت پر استوار کی ہے ۔ ان کے زمانے کے افکار و خیالات ، تصورات و نظریات ، عقائد و توہمات ، معیار و اقدار نے مل کر ان میں زندگی کا خون دوڑایا ہے ۔ اس لیے وہ اجنبی اور نامانوس نہیں معلوم ہوتے ۔ ان میں اس زمانے کی زندگی کی عکاسی نظر آتی ہے ۔ وہ اس زمانے کے ترجمان ہیں ۔ ان میں اس دور کے دل کی دھڑکن سنائی دیتی ہے ۔ میر نے

ان سب کو پیش کر کے اس عہد کے احساس اور شعور کی تصویر کشی کی ہے ۔ اُن کے آس پاس اور گرد و پیش جو کچھ سوچا جا رہا تھا ، اُنھوں نے اس کو غزل کی زبان میں تصوف اور فلسفے کے مسائل بنا کر پیش کر دیا ہے ۔

یہ ٹھیک ہے کہ یہ باتیں ، یہ معاملات و مسائل ، یہ افکار و خیالات ایسے کچھ نئے نہیں ہیں ۔ میر سے قبل بھی ان پر اظہار خیال ہوتا رہا ہے ۔ فارسی اور اردو کے شاعر ان پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالتے رہے ہیں ۔ لیکن میر نے ان کو زندگی سے ہم آہنگ کر کے حقیقتوں کا ایسا روپ دیا ہے اور ان حقیقتوں میں کچھ ایسے پہلو پیدا کیے ہیں جو انسان کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں اور دل و دماغ کے لیے جن سے غذا فراہم ہوتی ہے ۔ فلسفے کا یہی کام ہے اور میر کی شاعری کا یہی پہلو اس کام کو بخوبی انجام دیتا ہے ۔

اس لیے اُن کی شاعری کے اس پہلو کو اُن کے فکری پہلو سے تعبیر کرنا اور فلسفے سے اس کا رشتہ جوڑنا ایسا کچھ عجیب نہیں !

۹

میر کا فن

میر ریختے کے صناعِ طرفہ ہیں ۔ انھوں نے اس عیب کو ہنر سے بہتر کیا ہے ۔ وہ ایک اعلیٰ درجے کے فن کار اور ایک بہت بڑے خالقِ جمال ہیں ۔ باتوں کو شعر کا روپ دے دینا اُن کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے ۔ اُنھوں نے شعر نہیں کہے ، موتی سے پرونے ہیں ۔ یہی سبب ہے کہ ان کے تغزل اور تفکر دونوں میں غضب کی دل کشی اور بلا کی دلآویزی کا احساس ہوتا ہے ۔ اس کا راز میر کی فن کاری اور صناعی میں ہے ۔ فن کاری اور صناعی اُن کے اظہار و بیان ، انداز و اسلوب ، لب و لہجہ تشبیہات و استعارات ، علامات و اشارات اور الفاظ و زبان کے مجموعی امتزاج کا نام ہے ۔ یہ سب مل کر ان کی شاعری کے جمالیاتی پہلو کی تشکیل کرتے ہیں ، جن کے اثر سے ان کے یہاں تاثر کا سحر پیدا ہوتا ہے ۔ میر کی غزلوں میں سارا کھیل اسی جمالیاتی پہلو کا ہے ۔ ان کا کمال صرف اس بات میں نہیں ہے کہ انھوں نے تغزل اور تفکر دونوں کو اپنی غزلوں میں سمویا ہے اور حسن و عشق کی واردات و کیفیات اور

حیات و کائنات کے معاملات و مسائل کی تفصیل و جزئیات کو ان میں جگہ دی ہے ۔ ان کا کمال تو اس میں ہے کہ انھوں نے ان سب کو پیش کر کے غزل کے فنی اور جمالیاتی پہلوؤں کو ان کی انتہائی بلندیوں تک پہنچا دیا ہے ۔ اور جس کے باعث غزل کی صنف ان کے یہاں ہم دوشِ ثریا ہوگئی ہے ۔

اس صورتِ حال کے پیدا ہونے کا ایک سبب تو یہ ہے کہ میر غزل کے فن اور اس صنف کے بنیادی اصول کا گہرا شعور رکھتے ہیں ۔ انھوں نے غزل کی روایت کو صحیح طور پر سمجھا ہے اور سمجھ کر اس کو برتنے کی کوشش کی ہے ۔ اس لیے ان کی غزلوں میں فنی اعتبار سے ایک تجربے کا احساس بھی ہوتا ہے اور روایت اور تجربے کی اس ہم آہنگی ہی سے ان کے فن کی تشکیل ہوتی ہے۔ اس ہم آہنگی کو ان کے فنی شعور ہی نے پیدا کیا ہے ۔ اس فنی شعور کی بنیاد کچھ ان خیالات پر ہے کہ فن کی تشکیل معنویت اور خیال کے بغیر کوئی معنی نہیں رکھتی اور معنویت جگر کو خون کرنے کا نام ہے کہ اس کے بغیر فن میں گرمی اور روشنی کا پیدا ہونا ناممکن ہے ۔ چنانچہ میر کے خیال میں غزل موزوں کرنے کے لیے دل اور جگر کو خون کرنے کی ضرورت ہے ۔ اسی طرح فن زبان و دل کا ترجمان بنتا ہے ۔ اسی سے اس میں حسن و جمال کی قدر پیدا ہوتی ہے ۔ سادگی ، روانی ، پیچ داری ، رمزیت ، ایمائیت ، علامتیں ، اشارے ، تشبیہیں ، استعارے ، میر کے یہاں معنویت سے الگ کوئی حیثیت نہیں رکھتے ۔ معنویت ہی ان سب کو پیدا کرتی ہے اور اس طرح اِن کے ہاتھوں ان کے فن میں حسن کی اقدار کا وجود ہوتا ہے ۔ میر اس حقیقت کا گہرا شعور رکھتے ہیں ۔ اسی لیے ان کے فن میں محض صناعی کا احساس کسی ایک جگہ بھی نہیں ہوتا ۔ بر خلاف اس کے وہ فطری طور پر وجود میں آتی ہے ۔

(۲)

میر کا فن اُن کی شخصیت کا پرتو ہے ۔ جو کچھ اُن کی شخصیت میں تھا وہ ان کے فن میں بھی ہے ۔ جن عناصر سے ان کی شخصیت کی تشکیل ہوئی ہے وہی ان کے فن میں بھی نمایاں نظر آتے ہیں ۔ میر کی

شخصیت کا سب سے اہم پہلو ان کا خلوص و صداقت ہے ۔ دو رنگی اور منافقت سے وہ بہت دور تھے ۔ اسی لیے ان کے یہاں تکلف اور تصنع نہیں ہے ۔ مبالغہ آرائی اور انتہا پسندی نہیں ہے ۔ ان پر جو کچھ گزرتی ہے اس کا صحیح اور مکمل اظہار ان کے فن میں ہوتا ہے ۔ اسی لیے میر کے فن میں سب سے پہلے ایک بے ساختگی اور برجستگی کا احساس ہوتا ہے اور ان کے یہاں باتیں کرنے کی سی جو کیفیت نظر آتی ہے ، اس کا سبب بھی یہی برجستگی اور بے ساختگی ہے——ان کی سادگی اور سلاست جس کا اس قدر شہرہ ہے ، اور جس کی ان کے فن میں ایک لہر سی دوڑی ہوئی نظر آتی ہے ، وہ بھی درحقیقت اسی بے ساختگی اور برجستگی کا ایک پہلو ہے ۔ میر نے شعر کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے بات بنانے اور بات کرنے کو جو اتنی اہمیت دی ہے اس کا سبب بھی یہی سادگی کا خیال ہے ، اور اسی خیال کا یہ اثر ہے کہ میر نے باتوں کو شعر اور شعر کو باتوں کا روپ دے دیا ہے ۔ ان کے فن میں اسی لیے کسی طرح کی مشکل پسندی کا پتہ نہیں چلتا اور کسی قسم کی پیچیدگی نظر نہیں آتی ۔ برخلاف اس کے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ان کی کہی ہوئی بات پہلے سے پڑھنے والے کے دل میں موجود تھی ۔ اس لیے ان کا ہر خیال پڑھنے والے کو اپنا خیال معلوم ہوتا ہے ۔

اس بے ساختگی اور برجستگی ہی کا یہ اثر ہے کہ میر کے فن میں سادگی اور سلاست کا حسن ہے ۔ کسی ایک جگہ بھی اس حسن کا دامن ان کے فن کے ہاتھ سے نہیں چھوٹتا ۔ میر کے فن میں اظہار و ابلاغ چونکہ ایک فطری ردِ عمل کی حیثیت رکھتا ہے اس لیے اس میں تکلف اور تصنع کا شائبہ تک نہیں ہوتا ۔ ان کے فن میں پرکاری نہ ہونے کا بنیادی سبب بھی یہی ہے ۔ میر کا گہرا اور شدید تاثر ایک فطری اور واقعی ردِ عمل کی صورت میں اس طرح نمایاں ہوتا ہے کہ انہیں اس کی تراش خراش کا موقع ہی نہیں ملتا ، اور اسی لیے فنی اظہار کو پرکار بنا کر پیش کرنے کی نوبت ہی نہیں آتی ۔ میر کے فن میں تو بس سیدھی سادی باتیں ہوتی ہیں ۔ اس لیے ان کے یہاں سادگی کا حسن بھی نظر آتا ہے اور حسن کی سادگی بھی !

میر کے کلام میں اس سادگی کے حسن اور حسن کی سادگی کی ہر جگہ کارفرمائی ہے اور اس نے ان کے فن میں بڑے کارہائے نمایاں انجام دئیے ہیں ۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہیں کہ ان کے فن کا ہر پہلو درحقیقت اسی کا مرہونِ منت ہے ۔ ان کی زبان میں ، اندازِ بیان میں ترکیبوں میں ، تشبیہوں میں ، استعاروں میں ، اشاروں میں ، علامتوں میں بہت واضح طور پر اس سادگی کے اثرات کا پتہ چلتا ہے ۔

(۳)

میر کا فن غزل کا فن ہے اور انہوں نے اپنی غزلوں میں حسن و عشق کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی کی ہے ۔ حسن کا وہ رچا ہوا مذاق رکھتے تھے اور اس میں شک نہیں کہ انسانی حسن کی تصویر کشی انہوں نے بڑی خوبی کے ساتھ کی ہے لیکن اس کے باوجود ان معاملات کی ترجمانی میں ان کے یہاں رنگینی پیدا نہیں ہوتی ۔ کیونکہ سادگی کا حسن ان کے فن کو بیان کی رنگینی سے دور رکھتا ہے ۔ اسی لیے رنگین بیانی ان کے فن میں نظر نہیں آتی ۔ وہ تو بس سادہ پرکاری کے قائل ہیں اور اس سے اپنے فن میں ایک عمومی فضا قائم کرتے ہیں ۔ اسی لیے ان کے یہاں تزئین اور آرائش کا پتہ نہیں چلتا ۔ بجلی کی تیز روشنی کی سی چکمکاہٹ نظر نہیں آتی ۔ وہ جو فضا قائم کرتے ہیں اس پر نظر ٹھہر سکتی ہے ، خیرہ نہیں ہوتی ۔ اسی لیے ان کے فن میں رنگینی اور رعنائی کی جگہ نفاست اور لطافت ہے ، صفائی اور ستھرا پن ہے ، اور وہ اسی سے پہچانے جاتے ہیں ۔ خواہ وہ کسی موضوع کو بھی فن کے سانچے میں ڈھالیں ۔ ان کا یہ انداز بہر صورت باقی رہتا ہے :

میر ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

لعلِ خموش اپنے دیکھو ہو آرسی میں
پھر پوچھتے ہو ہنس کر مجھ بے نوا کی خواہش

سراپا میں اس کے نظر کر کے تم
جہاں دیکھو اللہ اللہ ہے

آگہ تو رہیے اس کی طرز و رہ و روش سے
آنے میں اس کے لیکن کس کو خبر رہے ہے

پیار کرنے کا جو خوباں ہم پہ رکھتے ہیں گناہ
اُن سے بھی تو پوچھتے تم اتنے کیوں پیارے ہوئے

رخسار اس کے ہائے رے جب دیکھتے ہیں ہم
آتا ہے جی میں آنکھوں کو اُن میں گڑوئیے

حیرت سے عاشقی کی پوچھا تھا دوستوں نے
کہہ سکتے تو کچھ تو کہتے شرما کے رہ گئے

میر سے پوچھا جو ہم عاشق ہو تم
ہو کے کچھ چپکے سے شرمائے بہت

بھاتی ہے مجھے اک طلب بوسہ میں وہ آن
لکنت سے اُلجھ جا کے آسے بات نہ آتی

ہر چند میں نے شوق کو پنہاں کیا ولے
اک آدھ حرف پیار کا منہ سے نکل گیا

چھپ لگ کے بام دور سے گلی کوچے میں سے میر
میں دیکھ لوں ہوں یار کو اک بار ہر طرح

کیا کیا لکھا ہے میں نے وہ میر کیا کہے گا
گم ہووے نامہ بر سے یا رب مری کتابت

آئے ہیں میر منہ کو بنائے خفا سے آج
شاید بگڑ گئی ہے کچھ اس بے وفا سے آج

ان اشعار میں محبوب کے حسن کا بیان بھی ہے اور ان روابط کا تذکرہ بھی جو محبوب اور محبت کرنے والے کے درمیان ہوتے ہیں ۔ لیکن ان میں کسی ایک جگہ بھی رنگینی اور رعنائی کے عناصر پیدا نہیں ہوتے ۔ حالانکہ ان موضوعات کو پیش کرنے میں رنگینی کا پیدا ہونا ایسا کچھ عجیب نہیں ہوتا ۔ لیکن میر اس سے بہت دور ہیں ۔ ان کے خیال ہی میں رنگینی نہیں ہے پھر بھلا اظہار میں اس کا وجود کس طرح ہو سکتا ہے ؟ ان کے یہاں تو خیال کی سادگی ہے اور اسی خیال کی سادگی نے ان کے فنی اظہار میں بھی سادگی کے عناصر پیدا کر دیے ہیں ۔

میر کے کلام میں رنگینی اور رعنائی کے پیدا نہ ہونے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ان کے خیالات "حزن و یاس اور رنج و الم سے علاقہ رکھتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے فن میں حزنیہ فضا اور ایک المیہ آہنگ کا احساس سب سے زیادہ ہوتا ہے ۔ یہ فضا اور یہ آہنگ بھی ان کے فن میں رنگینی اور پرکاری کو پیدا نہیں ہونے دیتے ۔ برخلاف اس کے سادگی ہی کی پرورش کرتے ہیں ۔ حزنیہ اور المیہ آرٹ میں تکلف اور صناعی کا پنپنا مشکل ہوتا ہے ۔ تزئین و آرائش کا چراغ اس محراب میں

نہیں جل سکتا ۔ میر کا فن بھی چونکہ بنیادی طور پر حزنیہ اور المیہ ہے ۔ اس لیے اس میں بھی یہی صورت حال ہے ۔ ان کا ہر شعر اس خیال کو صحیح ثابت کرتا ہے ۔

چونکہ میر غم زندگی کے فن کار ہیں ۔ اس لیے انسانی زندگی کا سارا گداز ان کے فن میں کھینچ کر آ گیا ہے ۔ اسی لیے اس میں سادگی کے ساتھ ایک آہستہ روی ، ایک نرمی ، ایک گھلاوٹ کا احساس سب سے زیادہ ہوتا ہے ، اور یہ خصوصیات غزل کے فنی اصول کے ساتھ مناسبت رکھتی ہیں ۔ میر کے یہاں شدید داخلیت ہے اور اسی داخلیت نے ان کے فن میں حزن و یاس کی فضا پیدا کرکے اس کو نرمی ، گھلاوٹ اور شیرینی سے آشنا کیا ہے ۔ میر کے خیالات اپنی سادگی اور معصومیت کے باعث بذات خود حد درجہ نرم اور شیریں ہوتے ہیں ۔ اس لیے ان کا اظہار بھی انہیں خصوصیات کے ساتھ ہوتا ہے ۔ ان کے ایک ایک لفظ سے جو گھلاوٹ اور شیرینی ٹپکتی ہے ۔ اس کا بنیادی سبب یہی ہے ۔

(۴)

میر کی شاعری غنائی شاعری کی تمام خصوصیات اپنے اندر رکھتی ہے ۔ اسی لیے اس میں فنی اعتبار سے دیکھا جائے تو ایک مترنم انداز ملتا ہے ۔ میر کے اظہار میں نغمگی ہوتی ہے ۔ لیکن یہ نغمگی محض الفاظ کے در و بست کے ہاتھوں پیدا نہیں ہوتی بلکہ اس میں جو خیال ہوتا ہے ۔ وہ اس نغمگی کو وجود میں لاتا ہے ۔ اس نغمگی میں بلند آہنگی نہیں ہوتی بلکہ آہستہ روی ہوتی ہے ۔ البتہ فطری بہاؤ اور روانی کا احساس اس میں ضرور ہوتا ہے ۔ اس روانی اور بہاؤ کو پیدا کرنے میں بحروں کے انتخاب کو بھی بڑا دخل ہے ، اور اس میں میر اپنا ثانی نہیں رکھتے ۔ انہیں خود بھی اس کا احساس ہے ۔ ایک جگہ اس کا اظہار بھی کیا ہے :

کہے میں نے اشعار ہر بحر میں
ولیکن قیامت روانی کے ساتھ

اور اس میں شک نہیں کہ میر نے جس طرح مختلف خیالات اور مختلف موڈ کے اظہار کے لیے مختلف بحروں کا انتخاب کیا ہے اس نے ان کے فن کو چار چاند لگا دئے ہیں ۔ انھوں نے چھوٹی سے چھوٹی بحروں میں بھی غزلیں کہی ہیں اور بڑی سے بڑی بحروں میں بھی ۔ انھوں نے فارسی کی مروجہ بحروں کو بھی استعمال کیا ہے اور ہندی کے پنگل کو بھی غزل کے مزاج سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے اور اس سے اُس غنائی کیفیت کو پیدا کرنے میں بڑا کام لیا ہے جو ان کے فن کا طرۂ امتیاز ہے ۔ ان بحروں میں الفاظ کے در وبست سے جو آہنگ پیدا ہوتا ہے اور اس کے نتیجے میں مجموعی طور پر جس غنائیت کی تشکیل ہوتی ہے ۔ اس میں بڑی ہی ڈوبی ہوئی کیفیت ہوتی ہے ، بڑا ہی رس ہوتا ہے ، کچھ ایسی نغمگی ہوتی ہے ۔ جس کا اثر کانوں سے کہیں زیادہ دل پر ہوتا ہے ۔ میر کی غنائیت تمام حواس کو متأثر نہیں کرتی بلکہ براہ راست دل پر اثر انداز ہوتی ہے ۔ اسی لیے اس میں وہ پہلو بہت زیادہ نمایاں نظر آتا ہے جس کو عام طور پر فن موسیقی میں آواز کے درد سے تعبیر کرتے ہیں ۔ میر کی لے بڑی دھیمی لیکن بے حد گداز ہے ۔ ان کا لہجہ بہت ہی نرم لیکن بلا کا پر سوز ہے ، اور اس کو پیدا کرنے میں ان کے بحروں کے انتخاب اور ان بحروں میں الفاظ کے مخصوص در و بست کا بڑا ہاتھ ہے ۔

(۵)

میر کا فن اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ وہ مکمل اظہار و ابلاغ کے قائل ہیں اور غیر شعوری طور پر ان کی ساری کوشش یہی ہوتی ہے کہ جو کچھ وہ کہنا چاہتے ہیں اس کا اثر بھرپور ہو ۔ ایسا کرنے کے لیے انھوں نے ایک طرف تو روایت کا سہارا لیا اور دوسری طرف اپنے ماحول کے گرد و پیش سے اثر قبول کرکے اظہار و ابلاغ کے نئے وسائل بھی تلاش کیے ہیں ۔ اسی لیے ان کے فن میں روایت اور تجربے کا ایک متوازن امتزاج بھی ملتا ہے اور اسی لیے اس فن میں جدت اور اُپج نمایاں نظر آتی ہے ۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو وہ ایک حد تک باغی بھی ہیں ۔ انھوں نے اپنے زمانے کی مروجہ روایات سے انحراف بھی کیا اور

اپنا ایک مخصوص انداز نکالا ہے ۔ میر سے قبل ایک دور ایسا گزر چکا تھا جب غزل کا فن ایہام گوئی سے عبارت تھا ۔ انھوں نے نہ صرف ایہام گوئی سے روگردانی کی بلکہ اس کو چھوڑ کر ان روایات سے استفادہ کرکے جو فارسی کے وسیلے سے ان تک پہنچی تھیں ، اپنے فن کو نئی بنیادوں پر استوار کیا ہے ۔ اسی لیے وہ اپنے پیش روؤں اور ہم عصروں سے اتنے مختلف نظر آتے ہیں اور ان کے فن میں جدت اور اپج کی وجہ سے اس قدر دل کشی کا پتہ چلتا ہے ۔ انھیں خود بھی اس حقیقت کا احساس ہے ۔ انھوں نے جو یہ شعر کہا ہے :

کیا جانوں دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میر کے
کچھ ایسی طرز بھی نہیں ایہام بھی نہیں

وہ بس یوں ہی نہیں کہہ دیا ہے ۔ اس کے پیچھے تو روایت اور تجربے کا وہ پورا پس منظر ہے جس سے اس وقت کی غزل کا فن دوچار تھا ، اور جس میں میر پیش پیش تھے ۔

فارسی کی شعری روایات کا میر پر گہرا اثر ہے ۔ لیکن وہ اس کے حلقہ بگوش نہیں ہیں ۔ انھوں نے ان روایات سے اس حد تک استفادہ کیا ہے جس حد تک ریختے کے فنی حدود نے اس کی اجازت دی ہے ۔ ان روایات نے انھیں لکیر کا فقیر نہیں بنایا ہے ۔ انھوں نے تو ان پر اجتہاد کیا ہے ۔ ان میں اضافے کیے ہیں ۔ ان کو نئے سانچوں میں ڈھالا ہے ۔ نئے آسمانوں پر پرواز سکھائی ہے ۔ نئے حالات سے آشنا کیا ہے ۔ اسی لیے ان کا سخن کسی سے نہیں ملتا اور ان کی گفتگو کا ڈھب سب سے جدا نظر آتا ہے :

نہیں ملتا سخن اپنا کسو سے
ہماری گفتگو کا ڈھب جدا ہے

میر اس اعتبار سے ایک بڑے صاحبِ کمال فن کار ہیں ، اور ان کا یہ کمال ان کی لفظی پیکر تراشی اور شاعرانہ انداز اور فن کارانہ لب و لہجہ میں نظر آتا ہے ۔ اس سلسلے میں ان کی تشبیہیں اور استعارے، علامتیں اور اشارے خاص طور پر اہمیت رکھتے ہیں ۔

میر کے فن میں تشبیہہ اور استعارے کا استعمال بھی بڑے سلیقے سے ملتا ہے ۔ لیکن وہ ذریعہ ہے ، مقصد نہیں ۔ میر اپنی تشبیہوں اور استعاروں سے ایک طرف تو اپنے خیال کو پوری طرح واضح کرتے ہیں اور دوسری طرف ایک ایسی فضا پیدا کرتے ہیں جس میں زندگی سے بھرپور تصویریں ان کے فن کو ایک نگار خانہ بنا دیتی ہیں ۔ ان کی تصویریں مبہم اور دور دراز کار نہیں ہیں ۔ لیکن ان میں ایک اچھوتا پن ضرور نظر آتا ہے ۔ کیونکہ وہ اپنے اندر ایک زندگی رکھتی ہیں ۔ میر کی تشبیہیں اور استعارے ان کی کوشش اور کاوش کی پیداوار نہیں ہیں ۔ بلکہ ان کے تخلیقی عمل کے ہاتھوں وہ فطری طور پر پیدا ہوتی ہیں ۔ میر نے کیسی کیسی عجیب تشبیہوں اور کیسے کیسے حیرت خیز استعاروں کی تخلیق کی ہے :

جب غبار اپنے دل کا نکلے ہے
دیر رہتی ہے آندھی کی سی دھوم

کارواں ہائے صبح ہوتے گیا
میں ستم دیدہ محو خواب رہا

عشق دریا ہے ایک لنگردار
تہہ کسو نے نہ اس کی پائی ہے

یادِ زلف یار جی مارے ہے میر
سانپ کے کاٹے کی سی یہ لہر ہے

دلِ پر خوں کی اک گلابی سے
عمر بھر ہم رہے شرابی سے

حاصل ہو کیا سوائے ترائی کے دہر میں
آٹھ آسماں تلے سے کہ شبنم بہت ہے یاں

آبلے کی سی طرح ٹھیس لگی پھوٹ بہی
درد مندی میں گئی ساری جوانی اس کی

شاخِ گل لچکے ہے تو جانوں ہوں
جلوہ گر یوں ہی یار ہوتا ہے

ان گل رخوں کی قامت لہکے ہے یوں ہوا میں
جس رنگ سے لچکتی پھولوں کی ڈالیاں ہیں

تو کہے واں ناگہاں بجلی گری
وہ نگاہِ تند کرتا ہے جہاں

چلنا ہوا تو قافلۂ روزگار سے
میں جوں صدا جرس کی اکیلا جدا گیا

یک بیاباں ہے مری بے کسی و تنہائی
مثلِ آوازِ جرس سب سے جدا جاتا ہوں

یک بیاباں بہ رنگ صوت جرس
مجھ پہ ہے بے کسی و تنہائی

آنچل اس دامن کا ہاتھ آتا نہیں
میر دریا کا سا اس کا پھیر ہے

ہے تصنع کہ لعل ہیں دے لب
یعنی اک بات سی بنائی ہے

ایسے ہنس مکھ کو شمع سے تشبیہہ
شمع مجلس کی رونی صورت ہے

میر تلوار چلتی ہے تو چلے
خوش خراموں کی چال ہے کچھ اور

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

دیدۂ گریاں ہمارا نہر ہے
دل خرابہ جیسے دلی شہر ہے

تری شورش پہ بےکل ہیں مگر میر
ملا دی پیس کر بجلی فغاں میں

حال گلزار زمانے کا ہے جیسے کہ شفق
رنگ کچھ اور ہی ہو جائے ہے اک آن کے بیچ

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

ان اشعار سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ میر تشبیہوں اور استعاروں کے ذریعے سے بعض کیفیات کی تصویر کشی کرتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ اس طرح ان کے ہاتھوں فن میں مصوری کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ میر کی ان تشبیہوں اور استعاروں میں ان کی تخئیل کا کمال نظر آتا ہے۔ اس تخئیل نے ان میں جدت پیدا کی ہے۔ میر اپنی تشبیہوں اور استعاروں کا خام مواد اپنے آس پاس اور گرد و پیش سے حاصل کرتے ہیں۔ اسی لیے ان کے نامانوس ہونے کا احساس نہیں ہوتا۔ مثلاً دل کے غبار نکلنے کی کیفیت کو آندھی کی سی دھوم سے تعبیر کرنا، عشق کو لنگر دار دریا کہنا، زلف یار کی یاد کو سانپ کے کاٹنے کی لہر سے نسبت دینا، دل پر خوں کی گلابی کی وجہ سے اپنے آپ کو شرابی بتانا، گل رخوں کی قامت کو پھولوں کی لچکتی ہوئی ڈالیوں سے تعبیر کرنا، بے کسی اور تنہائی کے ساتھ یک بیاباں بہ رنگ صوت جرس کا خیال آنا، دامن کو دریا کا سا پھیر بتانا، دل کو چراغ مفلس، دیدۂ گریاں کو نہر، خرابۂ دل کو دلی شہر کہنا، اور اسی قسم کی بے شمار باتیں اس حقیقت کو واضح کرتی ہیں کہ میر نے ان پیکروں کی تخلیق میں اپنی زندگی اور ماحول سے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔

(٦)

تشبیہات و استعارات کے ساتھ ساتھ میر کے فن میں رمزیت اور ایمائیت بھی خاصے کی چیز ہے۔ میر خود غزل کے فن میں تہہ داری کے کے قائل ہیں۔ چنانچہ اس تہہ داری کے اصول کو انھوں نے اپنے فن میں بھی برتا ہے۔ لیکن اس تہہ داری کے نتیجے میں جو رمزیت اور ایمائیت آن کے یہاں پیدا ہوتی ہے وہ کسی شعوری کوشش کا نتیجہ نہیں ہوتی بلکہ ان کا موضوع اور مواد ہی اس کو پیدا کرتا ہے۔ یہ چند اشعار اس

آنچل اس دامن کا ہاتھ آتا نہیں
میر دریا کا سا اس کا پھیر ہے

ہے تصنع کہ لعل ہیں دے لب
یعنی اک بات سی بنائی ہے

ایسے ہنس مکھ کو شمع سے تشبیہہ
شمع مجلس کی رونی صورت ہے

میر تلوار چلتی ہے تو چلے
خوش خراموں کی چال ہے کچھ اور

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

دیدۂ گریاں ہمارا نہر ہے
دل خرابہ جیسے دلی شہر ہے

تری شورش پہ بےکل ہیں مگر میر
ملا دی پیس کر بجلی فغاں میں

حال گلزار زمانے کا ہے جیسے کہ شفق
رنگ کچھ اور ہی ہو جائے ہے اک آن کے بیچ

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

ان اشعار سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ میر تشبیہوں اور استعاروں کے ذریعے سے بعض کیفیات کی تصویر کشی کرتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ اس طرح ان کے ہاتھوں فن میں مصوری کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ میر کی ان تشبیہوں اور استعاروں میں ان کی تخئیل کا کمال نظر آتا ہے۔ اس تخئیل نے ان میں جدت پیدا کی ہے۔ میر اپنی تشبیہوں اور استعاروں کا خام مواد اپنے آس پاس اور گرد و پیش سے حاصل کرتے ہیں۔ اسی لیے ان کے نامانوس ہونے کا احساس نہیں ہوتا۔ مثلاً دل کے غبار نکلنے کی کیفیت کو آندھی کی سی دھوم سے تعبیر کرنا، عشق کو لنگر دار دریا کہنا، زلف یار کی یاد کو سانپ کے کاٹنے کی لہر سے نسبت دینا، دل پر خوں کی گلابی کی وجہ سے اپنے آپ کو شرابی بتانا، گل رخوں کی قامت کو پھولوں کی لچکتی ہوئی ڈالیوں سے تعبیر کرنا، بے کسی اور تنہائی کے ساتھ یک بیاباں بہ رنگ صوت جرس کا خیال آنا، دامن کو دریا کا سا پھیر بتانا، دل کو چراغ مفلس، دیدۂ گریاں کو نہر، خرابۂ دل کو دلی شہر کہنا، اور اسی قسم کی بے شمار باتیں اس حقیقت کو واضح کرتی ہیں کہ میر نے ان پیکروں کی تخلیق میں اپنی زندگی اور ماحول سے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔

(٦)

تشبیہات و استعارات کے ساتھ ساتھ میر کے فن میں رمزیت اور ایمائیت بھی خاصے کی چیز ہے۔ میر خود غزل کے فن میں تہ داری کے کے قائل ہیں۔ چنانچہ اس تہ داری کے اصول کو انھوں نے اپنے فن میں بھی برتا ہے۔ لیکن اس تہ داری کے نتیجے میں جو رمزیت اور ایمائیت ان کے یہاں پیدا ہوتی ہے وہ کسی شعوری کوشش کا نتیجہ نہیں ہوتی بلکہ ان کا موضوع اور مواد ہی اس کو پیدا کرتا ہے۔ یہ چند اشعار اس

حقیقت کو واضح کرنے کے لیے کافی ہیں :

آوارگانِ عشق کا پوچھا جو میں نشان
مشت غبارے لے کے صبا نے اڑا دیا

صبح تک شمع سر کو دھنتی رہی
کیا پتنگے نے التماس کیا

کچھ کرو فکر مجھ دوانے کی
دھوم ہے پھر بہار آنے کی

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

کچھ موج ہوا پیچاں اے میر نظر آئی
شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی

لعلِ خموش اپنے دیکھو ہو آرسی میں
پھر پوچھتے ہو ہنس کر مجھ بےنوا کی خواہش

پھر جو دیکھا کچھ نہ تھا جز شعلۂ پر پیچ و تاب
شمع تک تو ہم نے دیکھا تھا کہ پروانہ گیا

گل کی جفا بھی دیکھی ، دیکھی وفائے بلبل
یک مشت پر پڑے تھے گلشن میں جائے بلبل

وصل اس کا خدا نصیب کرے
میر جی چاہتا ہے کیا کیا کچھ

پاسِ ناموسِ عشق تھا ورنہ
کتنے آنسو پلک تلک آئے

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے
اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

یہ شعر بڑے ہی پہلودار شعر ہیں ۔ ان میں تہہ داری کی خصوصیت اپنے شباب پر نظر آتی ہیں ۔ اسی تہہ داری نے ان میں دل موہ لینے والے انداز کو پیدا کیا ہے ۔

میر کے فن میں ان کی زبان کے استعمال اور لہجے نے بھی بڑا کام کیا ہے ۔ ان کی زبان میں فارسی کا غلبہ نہیں ۔ انہوں نے بول چال کی زبان میں شعر کہے ہیں ۔ پرکار ترکیبیں ان کے فن میں نظر نہیں آتیں ۔ برخلاف اس کے سیدھے سادے الفاظ کے در وبست کا پتہ چلتا ہے ۔ ان کا لہجہ نرم اور شیریں ہے جو غزل کے فن کے ساتھ بڑی مناسبت رکھتا ہے ۔

فن کی یہی خصوصیات ہیں جنھوں نے میر کو غزل کا ایک عظیم فن کار بنایا ہے ۔ انہیں کا یہ اثر ہے کہ وہ خود اپنے آپ کو ریختے کا صناع طرفہ سمجھتے ہیں ۔ چنانچہ یہ خیال ان کے دم کے ساتھ رہتا ہے کہ انہوں نے اس عیب کو ہنر سے بہتر کیا ہے اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ۔

یوں میر نے دوسری اصناف سخن میں بھی طبع آزمائی کی ہے ۔ اور ان اصناف میں بھی ان کا مرتبہ مسلم ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ طبعاً وہ غزل سے مناسبت رکھتے ہیں اور اسی لیے انہوں نے اس صنف کو اپنا میدان بنا لیا ہے۔غزل جیسی انہوں نے کہی ہے شاید اردو شاعروں میں کسی اور نے نہیں کہی اور اس میں شک نہیں کہ ان

سے بڑا غزل گو شاعر اُردو میں پیدا نہیں ہوا ۔ ان کا فن اکتسابی نہیں ہے ۔ انھوں نے صرف شاعری کرنے کے لیے شاعری نہیں کی ہے ۔ انھوں نے تو شعر کو سخن کا پردہ کیا تھا ۔ لیکن حالات نے اسی کو ان کا فن بنا دیا ۔ اسی لیے تو ان کے یہاں زندگی اور فن کا ایک ایسا حسین امتزاج ملتا ہے اور ان دونوں میں ایک ایسی متوازن ہم آہنگی نظر آتی ہے جس سے وہ ستر پردوں میں بھی پہچان لیے جاتے ہیں ۔

۱۰

میر کی اہمیت

اردو شاعری میں میر کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے ۔ انہوں نے اپنی شاعری میں جس طرح درد دل سنایا ہے ، انسانی زندگی کے جذباتی اور ذہنی ، معاشرتی اور تہذیبی معاملات کی جس طرح ترجمانی کی ہے ، زندگی کے حسن اور کائنات کی خوبصورتی سے جس انداز سے اپنی دلچسپی اور والہانہ شیفتگی کا اظہار کیا ہے ، انسان کی عظمت کی جس طرح نشاندہی کی ہے ۔ لیکن ساتھ ہی اس کے المیہ پہلوؤں کو جس طرح پیش کیا ہے ، غم اور عرفان غم کی جو باتیں کی ہیں اور تخلیق جمال کے جو اہم کارنامے انجام دیے ہیں ، ان کو سامنے رکھا جائے تو وہ بڑے ہی قد آور شخصیت کے شاعر نظر آتے ہیں ۔

اس حقیقت کو ہر دور میں محسوس کیا گیا ہے ۔ شدید عاجزی اور انکساری کے باوجود خود میر کے ہاں اپنی اس اہمیت کا شدید احساس ملتا ہے ۔ ان کے معاصرین بھی ان کی اہمیت کے قائل ہیں ۔ ان کے بعد آنے والوں نے بھی ان کی اہمیت کا احساس دلایا ہے ، اور جدید دور

میں بھی شعر و ادب کے دوربیں نباضوں اور دور رس نقادوں نے بھی نہ صرف شعر و ادب بلکہ زندگی میں ان کی اہمیت شدت کے ساتھ محسوس کی ہے اور اپنی تنقیدی تحریروں میں اس کا اعتراف کیا ہے ۔

پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ گذشتہ ڈیڑھ دو سو سال ہماری زندگی میں ایسے گزرے ہیں ، جب میر کی شخصیت اور شاعری کا جادو سر پر چڑھ کر بولا ہے ۔ ان کے اشعار نے دلوں میں جگہ بنائی ہے ۔ وہ افراد کے حواس پر چھائے رہے ہیں ۔ انہوں نے ان کے اندر زندگی کے غم اور رنج و الم کو برداشت کرنے کا حوصلہ پیدا کیا ہے اور ان سے نبرد آزما ہونے کے آداب انہیں سکھائے ہیں ۔

(۲)

میر کی شخصیت میں اپنے آپ سے بے نیازی اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی عاجزی اور انکساری اپنی انتہا پر پہنچی ہوئی تھی ۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ اپنے تذکرے نکات الشعراء میں اپنے متعلق صرف یہ دو تین جملے لکھنے پر اکتفا نہ کرتے ۔ اپنے ہم عصروں کے بارے میں تو انہوں نے اپنے اس تذکرے میں بہت کچھ لکھا ہے ۔ لیکن خود اپنے متعلق صرف یہ جملے لکھے ہیں :

"فقیر حقیر میر محمد تقی میر مؤلف ایں نسخہ ، متوطن اکبر آباد است ۔ بہ سبب گردش لیل و نہار از چندے در شاہجہان آباد است ۔"

البتہ انہوں نے دوسرے شعراء کے تذکرے میں کہیں کہیں ایسی باتیں ضرور کہی ہیں جن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں اپنی اہمیت کا کتنا احساس تھا ۔ مثلاً سراج الدین علی خاں آرزو کے ذکر میں ان کا یہ کہنا کہ :

"گاہے برائے تفنن طبع دو سہ شعر ریختہ فرمودہ ایں فن بے اعتبار را کہ ما اختیار کردہ ایم اعتبار دادہ اند ۔"

---

۱ ۔ میر : نکات الشعراء ص ۱۵۳
۲ ۔ ایضاً ص ۳

یا قزلباش خاں امید کے ذکر میں ان کا یہ کہنا کہ سید حسن رسول نما صاحب کے عرس کے موقع پر انھوں نے جب مجھے دور سے دیکھا تو کہا کہ میں نے بھی دو شعر اس زمانے میں ریختہ یعنی اردو میں کہے ہیں :

چوں مرا از دور دید گفت کہ خوش باشد کہ من ہم دریں ایام دو شعر ریختہ موزوں کردہ ام[1] ۔"

اگر میر کو اپنی اہمیت کا احساس نہ ہوتا تو وہ اس قسم کے فقرے نہیں لکھ سکتے تھے ۔ یہ فقرے اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ اردو شاعری میں انھیں ایک مخصوص مقام حاصل تھا ۔ پھر کہیں کہیں ایسا بھی ہوا ہے کہ انھوں نے اردو کے بعض شاعروں کا ذکر کرتے ہوئے ، ان کی تعریف کر کے ان کے کلام پر اصلاح بھی دے دی ہے ۔ مثلاً میر سجاد کے ذکر میں ان کے ایک شعر پر اصلاح دیتے ہوئے لکھتے ہیں :

"ہر چند در مثل تصرف جائز نیست زیرا کہ مثل ایں چنیں است کہ 'کیوں کانٹوں میں گھسیٹتے ہو' لیکن چوں شاعر را قادر سخن یافتم معاف داشتم[2] ۔"

پھر کہیں خواجہ میر دردؔ کے ذکر میں اس طرح کے فقرے لکھتے ہیں کہ :

"ایامے کہ فقیر بہ خدمت آں بزرگوار شرف اندوز می شد از زبان مبارکش می فرمود کہ میر محمد تقی تو میر مجلس خواہی شد[3] ۔"

اگر میر کو اپنے عہد میں اپنی شخصیت اور شاعری کی اہمیت کا احساس نہ ہوتا تو وہ اس قسم کی باتیں نہ کرتے ۔ ان باتوں سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ان کے زمانے کے بڑے بڑے شاعر اور بزرگ ان کی اہمیت کو محسوس کرتے تھے ۔

---

۱ ۔ ایضاً ص ۷

۲ ۔ ایضاً ص ۷۰

۳ میر : نکات الشعراء ص ۵۰

شاید اپنی اہمیت کے اسی شعوری یا غیر شعوری احساس کے پیش نظر میر نے اپنی غزلوں میں ایسے اشعار بھی کہے ہیں جن میں تعلّی کا رنگ ہے ۔ ان اشعار سے بھی میر کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے کیونکہ جو پہلو انہوں نے ان اشعار میں نمایاں کئے ہیں ان میں صداقت ہے اور وہ حقیقت پر مبنی ہیں ۔ مندرجۂ ذیل اشعار سے اس کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے :

دور تک رسوا ہوا ہوں شہروں شہروں ملک ملک
میرے شعر و شاعری کا تذکرہ گھر گھر ہے اب

شعر ہمارے عالم کے ہر چار طرف کیا دوڑے ہیں
کس وادی آبادی میں یہ حرف و سخن مشہور نہیں

جس شعر پر سماع تھا کل خانقاہ میں
وہ آج میں سنا تو ہے میرا کہا ہوا

ہے مری ہر اک غزل پر اجتماع
خانقہ میں کرتے ہیں صوفی سماع

وجد میں رکھتا ہے اہل شعر کو
میرے شعر و شاعری کا استماع

ذوقِ سخن ہوا ہے اب تو بہت ہمیں بھی
لکھ لیں گے میر جی کے اشعار چیدہ چیدہ

اشعار میر سب نے سن سن کے لکھ لیے ہیں
رکھیں گے یاد ہم بھی کچھ بیتیں چیدہ چیدہ

سرسبز ملک ہند میں ایسا ہوا کہ میر
یہ ریختہ لکھا ہوا میرا دکن گیا

سرسبز ہند ہی میں نہیں کچھ یہ ریختہ
ہے دھوم میرے شعر کی سارے دکن کے بیچ

کچھ ہند ہی میں میر نہیں لوگ جیب چاک
ہے میرے ریختوں کا دوانا دکن تمام

کس نے سن شعر میر یہ نہ کہا
کہیو پھر ہائے کیا کہا صاحب

سہل ہے میر کا سمجھنا کیا
ہر سخن اس کا اک مقام سے ہے

چاہیے وہ کہے سو لکھ رکھیں
ہر سخن میر کا کتاب ہے میاں

ہر بیت میں کیا میر تری باتیں گتھی ہیں
کچھ اور سخن کر کہ غزل سلکِ گہر ہے

نہ رکھو کان نظم شاعرانِ حال پر اتنے
چلو ٹک میر کو سننے کہ موتی سے پروتا ہے

اک آفتِ زماں ہے یہ میر عشق پیشہ
پردے میں سارے مطلب اپنے ادا کرے ہے

زلف سا پیچ دار ہے ہر شعر
ہے سخن میر کا عجب ڈھب کا

فکر کو نازک خیالوں کی کہاں پہنچے ہیں یار
ورنہ ہر مصرع میں یا معشوق شوخ و شنگ ہے

یہ میر ستم کشتہ کسو وقت جوان تھا
انداز سخن کا سبب شور و فغاں تھا
جس راہ سے یہ دل زدہ دلی میں نکلتا
ساتھ اُس کے قیامت کا سا ہنگامہ رواں تھا
افسردہ نہ تھا ایسا کہ جوں آب زدہ خاک
منہ تکیے، غزل پڑھیے ، عجب سحر بیاں تھا

ان اشعار سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ میر نے اپنے زمانے میں کتنی اہمیت اختیار کر لی تھی ۔ نہ صرف دلی اور شمالی ہندوستان بلکہ دکن کے دور دراز علاقوں تک ان کی شاعری کا شہرہ تھا ۔ افراد ان کی شاعری کے دیوانے تھے ۔ اپنی بیاضوں میں ان کے اشعار لکھ کر رکھتے تھے ۔ سماع کی محفلوں میں ان کے اشعار پڑھے جاتے تھے اور اہل حال ان کو سن کر بے حال ہو جاتے تھے ۔ اہل شعر میں بھی اُن کے اشعار کا چرچا تھا اور ان پر بھی ان اشعار کو سن کر وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی ۔ غرض میر کی مقبولیت پر شباب کا عالم تھا اور ہندوستان میں دور دور تک لوگ ان کی اہمیت کے قائل تھے ۔

اور اس کا سبب یہ ہے کہ ان کی شاعری ان کے دل کا مرثیہ تھی ۔ اس شاعری میں ہر بات اتنی وزنی ہوتی تھی کہ لوگ اسے کتاب سمجھتے تھے ۔ پھر اس بات کے کہنے کا انداز و اسلوب ایسا تھا کہ اس کی بدولت میر کی غزل سلک گہر بن گئی تھی ۔ میر نازک خیالوں کے شاعر تھے اور ان کے ہر مصرع اور ہر شعر میں ایک معشوق شوخ و شنگ

کی سی آن بان تھی ۔ ان کی شاعری کی تہہ داری اور پیچ داری ، رمزیت اور ایمائیت ، ان کی پہلو دار کیفیت ، آن کی سادگی اور سلاست نے عوام و خواص دونوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا ، اور وہ اس کو اپنے دلوں میں جگہ دینے لگے تھے ۔

میر نے اپنی عاجزی اور انکساری کے باوجود جگہ جگہ اپنے کلام میں اس حقیقت کے چہرے سے نقاب اٹھائی ہے ۔

(۳)

اس کے علاوہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ میر کی شخصیت اور شاعری کی ساحری نے ان کے تمام ہم عصروں کو مسحور کر لیا تھا ۔ آن کے زمانے میں جو تذکرے لکھے گئے ہیں ، ان سب میں میر کا ذکر اہتمام کے ساتھ کیا گیا ہے ، اور اس حقیقت کی وضاحت کی گئی ہے کہ وہ اپنے عہد کے بہت بڑے شاعر ہیں ۔ انھوں نے آردو کی شاعری میں گراں قدر اضافے کیے ہیں ، اور آن کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ لوگ آن کے اشعار پڑھتے پھرتے ہیں ۔

سید فتح علی حسینی گردیزی نے اپنا تذکرہ اگرچہ بقول ڈاکٹر مولوی عبدالحق غالباً میر کے تذکرے کے جواب میں لکھا ہے ۔ لیکن وہ بھی میر کے متعلق یہ چند جملے لکھنے کے لیے مجبور ہوگئے ہیں :

"سخن سنج بے نظیر میر محمد تقی میر تخلص ۔ زادگاہش اکبر آباد است و طبعش معنی ایجاد شمع استعدادش برکردہ شعلۂ ادراک سراج الدین علی خان آرزو است ۔ فقیر سیر اشعارش نمودہ و چشمے آب دادہ ۔ حقا کہ دراں تلاش معنی بیگانہ کردہ است و حرف آشنا را بروئے کار آوردہ است ۔"

حیرت ہے کہ گردیزی نے یہ جملے لکھ کر انتخاب کلام میں میر کا صرف ایک شعر نقل کیا ہے ۔ بہرحال گردیزی نے میر کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے ، اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ میر کی مقبولیت اور اہمیت کے پیش نظر میر کی تعریف ، ہر چند کہ وہ روکھی پھیکی

---

۱ ۔ گردیزی : تذکرۂ ریختہ گویان : ص

ہی سہی ، ناگزیر تھی ۔

قائم بھی میر کے ہم عصر ہیں ۔ انھوں نے اپنے تذکرے مخزن نکات میں میر کے متعلق مندرجۂ ذیل خیالات کا اظہار کیا ہے :

''معجز طراز کرامت تحریر محمد تقی متخلص بہ میر ، شاعر درست ۔ انواع شعر را بہ درستگی و وارفتگی سرانجام دید ۔ آبایش از نجبائے دارالخلافت اکبر آباد اند ۔ چوں بہ خان مغفرت نشان شیخ سراج الدین علی خان آرزو نسبت خواہرزادگی داشت بعد فوت والد بزرگوار بہ ہمیں مناسبت وارد شاہجہان آباد گردیدہ، مدتے بہ خدمت ایشاں استفادۂ آگاہی نمودہ اسم و رسمے بہم رسانیدہ ۔ چوں قریب بندہ خانہ تشریف دارد ، اکثر اتفاق ملاقات می افتد ۔ حق تعالیٰ سلامت با کرامت دارد ۔''

قائم کے اس بیان سے میر کے بارے میں یہ حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ وہ شاعر معجز بیان تھے اور انھوں نے مختلف اصناف شعر کو صحیح طور پر درستی اور وارفتگی کے ساتھ برتا ۔ ساتھ ہی اس بات کا علم بھی ہوتا ہے کہ انھوں نے سراج الدین علی خان آرزو کے زیر سایہ علم حاصل کیا جس کی بدولت انھیں شہرت اور ناموری سے ہم کنار ہونے کا موقع ملا ۔

قدرت اللہ شوق کا تذکرہ طبقات الشعراء بھی اس وقت لکھا گیا جب میر زندہ تھے ۔ اس کا سنہ تالیف ۱۱۸۹ھ/۱۷۷۵ء ہے ۔ شوق نے میر کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے زمانے میں ایک اہم زبان داں سمجھے جاتے تھے اور لوگ ان کی اس زبان دانی سے استفادہ کرتے تھے ۔ ان کے کلام میں تہہ داری اور پرکاری تھی ۔ حالانکہ ویسے وہ بڑے ہی سادہ گو تھے ۔

شوق لکھتے ہیں :

''محمد تقی ، تخلص میر ، متوطن اکبرآباد ، ہمشیر زادۂ سراج الدین علی خان آرزو ، مصنف تذکرۂ شعرائے ہندوستان ، صاحب دیوان

---

۱ ۔ قائم : مخزن نکات ، ص

مربوط و کلام ، از اعاظم مستعدان و اکابر عالی فطرتان زبان خواست ، شاعر پر مغز و ہمہ داں ، اُستاد ہم چشماں ، اکثر سخن طرازان و معنی یابان محاورات و روزمرات ایں فن از ایشان اخذ نمودہ اند ۔ از مغتنمات زمانہ و اُستاد یگانہ ، شہ سوار سمندِ عرصۂ فصاحت ، فارسِ مضمارِ بلاغت ، مجمع قابلیت و ہنر ، صاحب طبع و خوش فکر ، سرآمد مستعدانِ عصر ، محاورہ دان و متین ، متلاشیٔ مضامیں رنگین ، متجسس الفاظ چرب و شیریں ۔ ہر چند سادہ گو است امادر سادہ گوئی تہہ داری و پرکاری او ظاہر و نمودار است ۔"[۲]

میر حسن نے اپنا تذکرہ تذکرۂ شعرائے اردو ۱۱۸۸ء سے ۱۱۹۲ء کے درمیان لکھا ہے ۔ اس میں انھوں نے میر کا تذکرہ تفصیل سے کیا ہے اور انھیں میر شعرائے ہندوستان اور اُستاد صاحب قدرت قرار دیا ہے ۔ لکھتے ہیں :

"میر شعرائے ہندوستان و افصح فصحائے زماں ، شاعر دل پذیر و سخن سنج بے نظیر میاں محمد تقی المتخلص بہ میر ۔ رفعت رواقِ کاخ بیانش از طاق سپہر برتر ، و گوہر کان ضمیرش از جوہر سپہر عالی گوہر ، فکر عالیش در عین خوش آبی و طبع رواتش بہ نہایت شادابی ، چراغِ نثرش روشن و ساحتِ نظمش گلشن ۔ شعرش چوں در خوش آب و انداز سخنش بے حساب ، صیقل ذکائے اوزنگ زدائے آئینہ خورشید ، پیش ضیائے او روئے رخشاں ماہ سفید ۔ از اُستادان صاحب قدرت است ۔ طرز مانا بطرزِ شفائی ۔ بسیار بے دماغ است و دماغ اورای زیبد ۔"[۳]

یہاں میر حسن کا یہ لکھنا کہ میر بہت بے دماغ ہیں اور یہ بےدماغی انھیں زیب دیتی ہے ، اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ میر ایسے صاحب کمال تھے کہ اُن کی کمزوریوں کو بھی گوارا کیا جا سکتا تھا ۔ میر حسن

---

۲ ۔ قدرت اللہ شوق : طبقات الشعراء ، ص ۲۰۶

۳ ۔ میر حسن : تذکرۂ شعرائے اردو ، ص ۱۵۲

نے میر کے بارے میں یہ سب کچھ لکھ کر اپنے پورے عہد کی ترجمانی کی ہے اور اس طرح میر کی شخصیت اور شاعری کی اہمیت کو واضح کیا ہے ۔

میر حسن کے علاوہ مصحفی نے بھی اپنے تذکروں میں میر کی اہمیت کا اعتراف کیا ہے ۔ 'تذکرہ ہندی' اور 'عقد ثریا' دونوں میں میر کا ذکر ہے ۔ مصحفی تذکرہ ہندی میں لکھتے ہیں :

''میر محمد تقی میر تخلص کہ مفصل احوال ایشان در تذکرۂ فارسی سمت تحریر یافتہ ، شخص صاحب کمال است ۔ اکثر بے در فن ریختہ او را در پلہ مرزا رفیع سودا گرفتہ اند ۔ اکثر در غزل و مثنوی بہتر از مرزا قیاس می کنند و مرزا را در ہجو و قصیدہ ہر و فضیلت می دہند ۔ غرض ہر چہ ہست آستادی ریختہ بر و مسلم است ــــ ہمہ ریختہ گویان ہند سند از کلامش می آرند و او را دریں فن مستثنٰی می دانند و الحق کہ چنیں است[۱] ۔''

اور فارسی شعرا کے تذکرے ''عقد ثریا'' میں ان خیالات کا اظہار کرتے ہیں :

''میر محمد تقی میر ہمشیر زادۂ سراج‌الدین علی خان آرزو در فن شعر ریختہ مرد کمال است کہ مثل او از خاک ہند دیگر سر بر نیاوردہ ۔ چرخ پیر را سالہائے در از چرخ باید زد کہ ہم چو شخصے را بروئے کار آرد ۔ شعرِ ہندی را نسبت بہ دیگر شعرائے ریختہ گویاں بہ پاکیزگی و صفا گفتہ کہ فارسی گویاں را از رشکِ ریختہ اش خون در دل افتادہ بلکہ اکثر اشخاص موزوں طبع کہ ریختہ اش شنیدہ و مزۂ ایں زبان از زبانِ او دریافت کردہ فارسی گوئی را بر طاق بلند گذاشتند و توجہ بر ریختہ ریختہ اند[۲] ۔''

اس سے بڑی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ میر کے اردو کلام کو دیکھ کر آن کے بہت سے ہم عصروں نے فارسی میں شعر کہنا ترک

---

۱ ۔ مصحفی : تذکرۂ ہندی ، ص ۲۰۴

۲ ۔ مصحفی : عقد ثریا ، ص ۵۴

کر دیا ۔ مصحفی نے جو کچھ لکھا ہے وہ حرف بہ حرف صحیح ہے ۔ اس لیے کہ میر نے اردو شاعری میں وہ رس پیدا کیا جس کی وجہ سے اس وقت کے فارسی شعراء بھی اس سے متاثر ہوئے اور اردو میں شعر کہنے لگے ۔ مصحفی کے بیان سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ میر کو اپنے عہد میں مسلم الثبوت استاد تسلیم کیا جاتا تھا اور ان کے اشعار افراد کے دلوں میں اپنی جگہ بناتے تھے ۔

انیسویں صدی کے آخر میں جو تذکرے لکھے گئے ان میں بھی میر کا ذکر اچھے الفاظ میں ملتا ہے ۔ حالانکہ میر کی وفات کے بعد ساٹھ ستر سال میں حالات تیزی سے بدلے اور ادبی و شعری ذوق میں بھی نمایاں تبدیلیاں ہوئیں لیکن میر کی شخصیت اور شاعری کا جادو اس زمانے میں بھی سر پر چڑھ کر بولتا رہا ۔ اس زمانے کے سب سے اہم تذکرہ نگار نواب مصطفٰی خاں شیفتہ ہیں ۔ انہوں نے اپنے تذکرے ''گلشن بے خار'' میں میر کو افصح فصحا ، اشعر شعرا ، سخن ور عالی مقام کہا ہے اور لکھا ہے کہ :

''لطافت باطبعش ہم زاد است
صد آہ دردناک بہ تاثیر یک مصرعہ او نیست''[۱]

شیفتہ اپنے زمانے کے بڑے اہم نقاد تھے ۔ ان کے قلم سے میر کے متعلق اس قسم کے جملوں کا نکلنا یک غزل گو شاعر کی حیثیت سے میر کی اہمیت کو تسلیم کرنے کا بیّن ثبوت ہے ۔

غرض یہ کہ ہر تذکرہ نگار نے ہر دور میں میر کو بڑا شاعر تسلیم کیا ہے اور وہ سب کے سب میر کی اہمیت کے اعتراف میں پیش پیش رہے ہیں ۔

(۲)

اور پھر انیسویں صدی کے سب سے اہم شاعر غالبؔ نے اپنے اشعار میں میر کو خراج تحسین پیش کیا اور عقیدت کا اظہار کر کے میر کی

---

۱ ۔ شیفتہ : گلشن بے خار ، ص ۵۳

اہمیت کو محسوس کرایا ۔ غالب کے یہ شعر میر کی اہمیت کو ذہن نشین کراتے ہیں :

ریختے کے تمھیں اُستاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

میر کے شعر کا احوال کہوں کیا غالب
جس کا دیوان کم از گلشنِ کشمیر نہیں

اور غالب کے ساتھ ساتھ ذوق نے بھی میر کی اہمیت کا اعتراف کیا ، اور یہ شعر کہا :

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب
ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

یہ تو خیر شاعروں کی باتیں تھیں جن کا اظہار اشعار میں ہوا لیکن اُنیسویں صدی کے آخری چند سال اور بیسویں صدی کا پورا زمانہ میر کی اہمیت کے نہ صرف اعتراف کا زمانہ ہے بلکہ اس زمانے میں میر کو سمجھنے کی کوشش اس لیے کی گئی ہے کہ اُن کے کلام کو تجزیاتی زاویہ نظر سے دیکھنے کا ایک ماحول پیدا ہوا ہے ۔

اس زمانے میں مولانا محمد حسین آزاد نے سب سے پہلے میر کے کلام کو سمجھنے اور سمجھانے اور اس کو صحیح تنقیدی زاویہ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی ۔ میر اور اُن کی شاعری کے متعلق انھوں نے ان خیالات کا اظہار کیا ہے :

”میر صاحب کی زبان شستہ ، کلام صاف ، بیان ایسا پاکیزہ جیسے باتیں کرتے ہیں ، دل کے خیالات کو جو کہ سب کی طبیعتوں کے مطابق ہیں ، محاورے کا رنگ دے کر باتوں میں ادا کر دیتے ہیں

اور زبان میں خدا نے ایسی تاثیر دی ہے کہ وہی باتیں ایک مضمون بن جاتی ہیں ۔ اسی واسطے اُن میں بہ نسبت اور شعراء کے اصلیت کچھ قائم رہتی ہے ۔ بلکہ اکثر جگہ یہی معلوم ہوتا ہے گویا نیچر کی تصویر کھینچ رہے ہیں ۔ یہی سبب ہے کہ دلوں پر بھی اثر زیادہ کرتی ہیں ۔ وہ گویا اُردو کے سعدی ہیں ۔ ہمارے عاشق مزاج شعراء کی رنگینیاں اور خیالات کی بلند پروازیاں ، اُن کے مبالغوں کے جوش و خروش سب کو معلوم ہیں ۔ مگر اسے قسمت کا لکھا سمجھو کہ ان میں سے بھی میر صاحب کو شگفتگی یا بہار عیش و نشاط یا کامیابیٔ وصال کا لطف کبھی نصیب نہ ہوا ۔ وہی مصیبت اور قسمت کا غم جو ساتھ لائے تھے ، اُس کا دکھڑا سناتے چلے گئے جو آج تک دلوں میں اثر اور سینوں میں درد پیدا کرتے ہیں ۔ کیونکہ ایسے مضامین اور شعراء کے لیے خیالی تھے ، اُن کے حالی تھے ۔ عاشقانہ خیالات میں ناکامی ، زارنالی . حسرت ، مایوسی ، ہجر کے لباس میں خرچ ہوئے ۔ اُن کا کلام صاف کہہ دیتا ہے کہ جس دل سے نکل آیا ہوں وہ غم و درد کا پتلا نہیں ، حسرت و اندوہ کا جنازہ تھا ۔ ہمیشہ وہی خیالات بسے رہتے تھے ۔ بس جو دل پر گزرتی تھی وہی زبان سے کہہ دیتے تھے کہ سننے والوں کے لیے نشتر کا کام کر جاتے تھے ۔ اُن کی غزلیں ہر بحر میں کہیں شربت اور کہیں شیر و شکر ہیں مگر چھوٹی چھوٹی بحروں میں فقط آب حیات بہاتے ہیں ۔ جو لفظ منہ سے نکلتا ہے تاثیر میں ڈوبا ہوا نکلتا ہے[1] ۔"

آزاد کی ان باتوں میں بڑا وزن ہے ۔ یہ خیالات غور و فکر کا نتیجہ ہیں ۔ ان میں میر کو سمجھنے اور اُن کے کلام کی روح سے آشنا ہونے کا بڑا سامان ہے ۔ یہ خیالات تنقیدی ہیں ۔ ان میں تجزیے کا عنصر ہے ۔ اور ان کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مسلمانوں کی نشاۃ الثانیہ کے اسی دور کی پیداوار ہیں جس کا آغاز جنگ آزادی کے بعد سرسید احمد خاں کی تحریک کے زیر اثر ہوا تھا ۔

---

۱ ۔ مولانا محمد حسین آزاد : آب حیات ، ص ۲۱۲

میر کی شخصیت اور شاعری کی اہمیت کو اس طرح واضح کرنے کے ساتھ ساتھ آزاد نے شاعری کے علاوہ میر کی دوسری تصانیف کی نشان دہی بھی کی ، اور میر کے بیان میں ذکر میر ، فیض میر اور نکات الشراء کا ذکر بھی کیا ۔ چنانچہ ان تصانیف کی اہمیت کے پیش نظر محققین نے تصانیف میر کے قلمی نسخوں کو تلاش کیا اور ان کو مرتب کرکے شائع کرنے کے منصوبے بنائے ۔

سب سے پہلے بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے ذکر میر کو مرتب کرکے مع ایک مقدمے کے انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن سے شائع کیا ۔ یہ کتاب ۱۹۲۸ع میں منظر عام پر آئی ۔ اس سے قبل مولوی صاحب مرحوم نے ذکر میر پر ایک مفصل مضمون رسالۂ اردو میں شائع کیا ، جس میں میر کی اس خود نوشت سوانح حیات کو تقریباً مکمل طور پر اردو میں منتقل کر دیا ۔ اس کے بعد انہوں نے نکات الشعراء کو مرتب کرکے شائع کیا ۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۲۹ع میں انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن سے شائع ہوا ۔ فیض میر کو پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب نے مرتب کیا ، اور ۱۹۲۹ع میں اس دلچسپ کتاب کو اُردو دنیا سے روشناس کرایا ۔

پھر ۱۹۲۸ع میں رسالہ نیرنگ رام پور نے میر نمبر شائع کیا جس میں میر کی شخصیت اور شاعری کے مختلف پہلوؤں پر عزیز لکھنؤی ، سہبا مجددی ، محشر لکھنؤی ، مرزا جعفر علی خاں اثر ، عالی لکھنؤی اور عشرت رحمانی کے مقالات شامل تھے ۔ ان مقالات سے میر اور کلام میر کی اہمیت کا اندازہ ہوا ، اور اس کے سنجیدہ مطالعے کے لیے ایک فضا پیدا ہوئی ۔ چنانچہ چند سال کے اندر میر کے کلام کے انتخابات شائع ہونے شروع ہوئے ۔ شاید اس وجہ سے کہ میر کا کلیات بہت ضخیم تھا اور اس کے انتخاب کی ضرورت تھی ۔ سب سے پہلے بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے انتخاب کلام میر کے نام سے ایک مقدمے کے میر کی غزلوں کا انتخاب شائع کیا جو بہت مقبول ہوا ۔ مرزا جعفر علی خاں اثر نے بھی ''مزامیر'' کے نام سے دو جلدوں میں میر کا انتخاب شائع کیا اور محمد حسن عسکری نے ساقی کا ایک خاص نمبر میر کے انتخاب کلام کے لیے

وقف کیا ۔ یہ انتخابات بھی میر کی اہمیت کو واضح کرتے ہیں ۔

غرض یہ کہ گذشتہ پچاس ساٹھ سال میں جو کتابیں شائع ہوئیں ان کی بدولت میر کے مطالعے کے لیے ایک ماحول پیدا ہوا ، اور اس ماحول نے جدید دور کے اہم نقادوں کو بھی میر کی طرف متوجہ کیا اور بعض بڑے ہی خیال انگیز مضامین و مقالات میر کے متعلق لکھے گئے ۔

(۵)

گذشتہ نصف صدی میں میر پر مضامین تو خاصی تعداد میں لکھے ہیں لیکن جن مضامین میں تنقیدی بصیرت ملتی ہے اُن میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق ، پروفیسر مجنوں گورکھ پوری، پروفیسر آل احمد سرور ، ڈاکٹر خواجہ احمد فاروق، ڈاکٹر سید عبداللہ اور پروفیسر محمد حسن عسکری کے مضامین خاص طور پر اہمیت رکھتے ہیں ۔ ان مضامین سے میر کی شخصیت اور شاعری کے بعض نئے گوشے سامنے آتے ہیں اور اُن کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے ۔

ڈاکٹر مولوی عبدالحق لکھتے ہیں :

"میر تقی میر سرتاجِ شعرائے اردو ہیں ۔ اُن کا کلام اسی ذوق و شوق سے پڑھا جائے گا جیسے سعدی کا کلام فارسی میں ۔ اگر دنیا کے ایسے شاعروں کی ایک فہرست تیار کی جائے جن کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا تو میر کا نام اس فہرست میں ضرور داخل ہوگا ۔ یہ اُن لوگوں میں نہیں ہیں جنھوں نے موزونیٔ طبع کی وجہ سے ، یا اپنا دل بہلانے کی خاطر یا دوسروں سے تحسین سننے کے لیے شعر کہے ہیں ۔ بلکہ یہ اُن لوگوں میں سے ہیں جو ہمہ تن شعر میں ڈوبے ہوئے تھے اور جنھوں نے اپنے کمال سے اردو کی فصاحت کو چمکایا اور زبان کو زندہ رکھا ۔ شاعری میر صاحب کی زندگی کا جز تھی ۔ گویا فطرت نے اُنھیں اسی سانچے میں ڈھالا تھا ۔ اُن کا احسان اردو زبان پر تا قیامت قائم رہے گا ، اور اُن کے کلام کا لطف کسی زمانے میں کم نہ ہوگا ۔ کیونکہ اُس میں وہ عالم گیر حسن ہے

جو کسی خاص وقت یا مقام سے مخصوص نہیں[1]۔"

"میر صاحب کے کلام میں ایسے حیرت انگیز جلوے اکثر نظر آتے ہیں۔ جس طرح بعض اوقات سمندر کی سطح دیکھنے میں معمولی اور بے شور و شر نظر آتی ہے لیکن اس کے نیچے ہزاروں لہریں موج زن ہوتی اور ایک کھلبلی مچائے رکھتی ہیں اسی طرح اگرچہ میر صاحب کے اشعار کے الفاظ ملائم، دھیمے، سلیس اور سادہ ہوتے ہیں لیکن اُن کی تہہ میں غضب کا جوش یا درد چھپا ہوتا ہے۔ الفاظ کی سلاست اور ترتیب کی سادگی لوگوں کو اکثر دھوکا دیتی ہے۔ وہ اُن میں سے بے خبر گزر جاتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ شاعر نے ان سلیس الفاظ اور معمولی ترتیب میں کیا کیا کمال بھر رکھے ہیں[2]۔"

پروفیسر مجنوں گورکھ پوری لکھتے ہیں:

"میر کے بارے میں عام رائے یہ ہے کہ وہ یاس پرست تھے اور اُن کی شاعری پر قنوطیت چھائی ہوئی ہے۔ وہ زندگی اور عشق دونوں کے حوصلے ہم سے چھین لیتے ہیں۔ مجھے اس رائے سے ہمیشہ اختلاف رہا۔ میر اپنے دور کی بدحالی اور اپنے نجی سانحات زندگی سے بغاوت کی حد تک نا آسودہ تھے، اور اُن کے بیشتر اشعار پر گہری نگاہ ڈالی جائے تو اُن کے لہجے میں بغاوت کا ایک مخصوص اور پر تمکنت احساس ملے گا[3]۔"

"میر خود ایک جری انسان تھے اور اُن کا کلام ہم کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ چاہے ہمارے سر سے موجِ خوں ہی کیوں نہ گزر جائے

۱۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق: مقدمہ انتخاب کلام میر، ص ۱
۲۔ ایضاً، ص ۲۰
۳۔ مجنوں گورکھ پوری: نقوش و افکار (میر اور ہم)، ص ۱۵

ہم کو جرأت رندانہ نہیں بلکہ جرأت مردانہ کے ساتھ تمام صعوبتوں اور آزمائشوں کا مقابلہ ایک سورما کی طرح کرنا چاہیے[1]۔"

"میر کے کلام کے مطالعے سے ہمارے جذبات و خیالات اور ہمارے احساسات و نظریات میں وہ ضبط اور سنجیدگی پیدا ہوتی ہے جس کو صحیح معنوں میں تحمل کہہ سکتے ہیں ۔ یہ وہ تحمل ہے جو انسان کی فکری اور عملی قوت میں توازن اور تمکنت اور مزید توانائی پیدا کرتا ہے[2]۔"

"پروفیسر آل احمد سرور لکھتے ہیں :

"میر کی شاعری کی اہمیت کے اسباب ظاہر ہیں ۔ اُن کے خیالات میں گہرائی ، جذبات میں خلوص اور اظہار میں کیفیت ہے ۔ یوں تو اُن کی نظر انتخابی ہے ، یعنی زندگی کے مخصوص پہلوؤں کی زیادہ کامیاب مصوری کرتے ہیں مگر اس انتخاب میں بھی قوس قزح کی سی دلآویزی اور رنگا رنگی ہے[3]۔"

"میر کے یہاں ایک دردمند انسانیت کی فریاد اور ایک حساس اور خوددار شخص کا خاموش گریہ ملتا ہے ۔ میر کے رنگ کو اگر ہم چاہیں تو شبنمی رنگ کہہ سکتے ہیں[4]۔"

"اگر میر کے یہاں صرف شباب کے ہیجان کی داستان ہوتی تو اس کی اتنی اہمیت نہ تھی ۔ میر کے یہاں یہ ایک وضع جنوں بن گئی ہے اور اس وضع جنون میں عاشقی ہی نہیں زندگی کی کچھ بڑی قدریں

---

۱ ۔ مجنوں گورکھ پوری : نقوش و افکار (میر اور ہم) ، ص ۱۸
۲ ۔ ایضاً ، ص ۲۵
۳ ۔ پروفیسر آل احمد سرور : میر کے مطالعے کی اہمیت (فکر و نظر) ، ص ۹
۴ ۔ ایضاً ، ص ۱۱

بھی شامل ہیں - کسی نے ٹھیک کہا ہے کہ اعلیٰ درجے کی عشقیہ شاعری محض عشقیہ نہیں ہوتی ، کچھ اور بھی ہوتی ہے - دل پر خون کی اک گلابی سے جو شخص عمر بھر شرابی رہے اُس کی مستی زندگی میں بھی کچھ معنی رکھتی ہے[1]۔"

"میر اس مستی رومانیت سے بلند ہیں جو اپنے خواب و خیال کی مستی کی وجہ سے سنگین حقائق کا احساس نہیں رکھتی - اُنھیں زندگی کی سنگینی اور ٹھوس حقیقتوں کا پورا پورا احساس ہے - زندگی اُن کے نزدیک ایک گھمبیر اور عظیم شے ہے ، اور انسان زندگی کے صحرا میں اُس قطرۂ شبنم کی طرح ہے جو خار بیاباں میں رکا ہوا ہے — میر کی شاعری میں قطرۂ شبنم اور خار بیاباں دونوں کا احساس ملتا ہے[2]۔"

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی لکھتے ہیں :

"تغزل کے میدان میں میر کی ہمسری کا دعویٰ آج تک کسی کو نصیب نہیں ہوا - اُنھوں نے جس درد و سوز کے ساتھ یہ نغمہ چھیڑا ہے اُس کی مثال نہیں ملتی - میر کی فتادگی و دل سوزی ، خستگی و برجستگی نے تغزل میں ایک معیاری شان پیدا کی ہے ، اور اُن کے کلام کو سوز و گداز کا آتش کدہ بنا دیا ہے[3]۔"

"غم عشق اور غم روزگار نے میر کی ہستی کو مٹا دیا لیکن یہ ہی خاکستر سمندر کی طرح اُن کی شاعرانہ زندگی کا سامان وجود ہے[4]۔"

---

۱ - پروفیسر آل احمد سرور : میر کے مطالعے کی اہمیت (فکر و نظر) ، ص ۱۴

۲ - ایضاً ، ۱۷

۳ - خواجہ احمد فاروقی : میر — حیات اور شاعری ، ص ۳۲۱

۴ - ایضاً ، ۳۲۳

"میر کے تجربات ذاتی مصائب کے پیدا کردہ بھی تھے اور اجتماعی ناسازگار حالات کا نتیجہ بھی - یہ چبھن اور جلن اُن کے یہاں آپ بیتی ہی کی نہیں جگ بیتی کی بھی ہے - اسی لیے اُن کی محرومیاں بڑی درد انگیز ہیں[۱]-"

ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں :

"وہ (میر) جذبات غم کے مصور ہونے کے باوجود فطرت کے مشاہدات کے بے نظیر مصور بھی تھے اور ان سب باتوں کے ساتھ اُنھوں نے زندگی کے حقائق پر غور بھی کیا ہے - جس کا ثبوت اُن کی شاعری سے مہیا ہوتا ہے[۲]-"

پروفیسر محمد حسن عسکری لکھتے ہیں :

"زندگی کے متعلق جس قسم اور جس کیفیت کا شعور مجھے میر کے یہاں ملتا ہے ویسا شعور میں نے انگریزی شاعری کے اپنے مختصر سے مطالعے میں کہیں اور نہیں پایا[۳]-"

"میر اپنی خودی کو عام انسانوں کے سامنے پیش کرنے سے نہیں جھجکتے- اگر وہ دوسرے انسانوں کی اقدار اور عملی دنیا کی اہمیت کو کلیتاً قبول کر لیتے تو شاعر نہیں ہو سکتے تھے ، اودھ کے جاگیردار البتہ ہوتے - اُنھیں اپنی قدروں ، اپنے آدرشوں اور اپنی انفرادیت پر پورا یقین ہے ، حد درجہ محبت ہے لیکن وہ اُن کے مقابل کی دوسری حقیقت کو رد نہیں کرتے - یہی میر کی عظمت ہے[۴]-"

---

۱ - خواجہ احمد فاروقی : میر—حیات اور شاعری ، ص ۳۲۲

۲ - ڈاکٹر عبداللہ : نقد میر ، ص ۱۰۵

۳ - محمد حسن عسکری : میر جی، (رسالہ ساقی، میر نمبر ۱۹۳۷ء) ، ص ۲۷۹

۴ - ایضاً ، ص ۲۷۸

”میر نے زندگی کے متعلق جو کچھ سوچا اور سمجھا ہے اس کا لب لباب یہ ہے کہ بھرپور زندگی اسی وقت مل سکتی ہے جب آدمی اپنی خودی کو کائنات ، زندگی اور عام انسانوں کے سامنے نذر کر دے لیکن ساتھ ہی اپنی خودی سے مایوس اور بیزار بھی نہ ہو ، اور یہ رائے کوئی قنوطیت پسند اور یاس پرست آدمی نہیں دے سکتا[1]۔“

یہ اقتباسات میر کی شخصیت اور شاعری کی بنیادی خصوصیات کی اہمیت کو ذہن نشین کراتے ہیں ۔ اس میں جو تہیں ہیں ان کو کھولتے ہیں ۔ ان میں جو تنقیدی بصیرت ہے وہ میر کی عظمت کو ہمارے سامنے بے نقاب کر دیتی ہے ۔ ان سے ہمارے دلوں میں یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ میر یگانۂ روزگار تھے ۔ وہ ایک بڑے انسان تھے ۔ ایک عظیم شاعر تھے ۔ انھوں نے انسانی زندگی کے ان گنت پہلوؤں کی ترجمانی اس طرح کی ہے کہ ان کے تجربات دلوں میں اترتے ہیں اور ان کے افکار و خیالات حواس پر خوشی بن کر چھاتے ہیں ۔ انھوں نے انسانیت کے نغمے گائے ہیں ۔ انسانی اقدار کا درس دیا ہے ۔ انسان کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونا سکھایا ہے ۔ ناسازگار حالات کو برداشت کرنے اور ان سے نبرد آزما ہونے کے حوصلے اور ولولے دلوں میں پیدا کیے ہیں ۔ انھوں نے غم کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے کی ضرورت پر زور دیا ہے ، اور غم کھانے کی بجائے عرفانِ غم کی اہمیت واضح کی ہے ۔ انھوں نے زندگی کی سنگینی کے شعور کو بیدار کیا ہے جس کی بدولت انسان صحیح معنوں میں انسان بنتا ہے ۔ اپنے آپ کو پہچانتا ہے ۔ اپنی خودی کو بیدار کرتا ہے اور اپنے آپ کو زندہ رکھنا چاہتا ہے ۔ زیست کرنے اور جینے کی خواہش ہر لمحہ اس کے دل میں چٹکیاں سی لیتی ہے ۔ وہ زندگی کی رنگینیوں اور رعنائیوں سے رس نچوڑنا چاہتا ہے ۔ یہ اور بات ہے کہ اس میں اسے خاطر خواہ کامیابی سے ہم کنار ہونا نصیب نہیں ہوتا ۔

---

۱ ۔ محمد حسن عسکری : میر جی (رسالۂ ساقی) ص ۲۸۲ ۔

میر کی شخصیت میں انھیں خیالات کا عکس نظر آتا ہے اور ان کی شاعری انھیں افکار و خیالات کے گرد گھومتی ہے - اسی لیے اس کا اثر ہر انسان پر ہوتا ہے - وہ شاعری سے زیادہ ساحری ہے - اس کا جادو سر پر چڑھ کر بولتا ہے - وہ جادو جگاتی ہے - اس میں ایک عجیب سی کشش ہے جو دلوں کو اپنی جانب کھینچتی ہے - وہ بڑے بڑے فرزانوں کو اپنا گرویدہ بناتی ہے - وہ جاوداں ہے ، لازوال ہے - ہمیشہ زندہ رہنے والی ہے - وقت کا ظالم ہاتھ بھی اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا -

اسی لیے تو اس میں دور دور تک میر کی یہ آواز گونجتی ہوئی سنائی دیتی ہے :

پڑھتے پھریں گے گلیوں میں ان ریختوں کو لوگ
مدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں

جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز
تا حشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا

کتابیات

۱ - کلیات میر : مطبوعہ ہندوستانی پریس کلکتہ ، (مرتبہ فورٹ ولیم کالج) : ۱۸۱۰ء -

۲ - کلیات میر : نول کشور پریس ، مرتبہ مولانا عبدالباری آسی ، ۱۹۴۱ء -

۳ - کلیات میر : انٹرنیشنل پریس کراچی ، مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی ، ۱۹۵۸ء -

۴ - انتخاب کلام میر : انجمن پریس کراچی ، مرتبہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق ، چھٹا ایڈیشن ، ۱۹۵۰ء -

۵ - مزامیر : کتابی دنیا لمیٹڈ ، دہلی ، مرتبہ مرزا جعفر علی خاں اثر ، ۱۹۴۷ء -

۶ - انتخاب کلام میر : ساقی کراچی ، مرتبہ محمد حسن عسکری ، ۱۹۵۸ء -

۷ - ذکر میر : انجمن ترقیٔ اردو ، اورنگ آباد دکن ، مرتبہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق ، ۱۹۲۸ء -

۸ - نکات الشعرا : انجمن ترقیٔ اردو ، اورنگ آباد دکن ، مرتبہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق ، ۱۹۳۵ء -

۹ - فیضِ میر : نظامی پریس ، لکھنؤ ، مرتبہ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب ، ۱۹۲۹ء -

۱۰ - رسالہ نیرنگ : رام پور ، میر نمبر ، ۱۹۲۸ء -

۱۱ - گردیزی : تذکرۂ ریختہ گویاں ، انجمن ترقیٔ اردو ، اورنگ آباد دکن ، مرتبہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق ، ۱۹۳۳ء -

۱۲ - قائم : مخزن نکات -

۱۳ - قدرت اللہ شوق : طبقات الشعرا ، مرتبہ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی ، مجلس ترقی ادب ، لاہور ، ۱۹۶۸ء -

۱۴ - میر حسن : تذکرۂ شعرائے اردو ، مرتبہ مولانا حبیب الرحمان شیروانی ، انجمن ترقیٔ اردو ، دہلی ، ۱۹۴۰ء -

۱۵ - مصحفی : عقد ثریا ، مرتبہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق ، انجمن ترقیٔ اردو ، اورنگ آباد دکن ، ۱۹۳۴ء -

۱۶ - مصحفی : تذکرۂ ہندی ، مرتبہ ڈاکٹر عبدالحق ، انجمن ترقیٔ اردو ، اورنگ آباد دکن ، ۱۹۳۳ء -

۱۷ - شیفتہ : گلشنِ بے خار ، نول کشور ، لکھنؤ -

۱۸ - آبِ حیات : شیخ مبارک علی ، لاہور -

۱۹ - طفیل احمد : یادگار شعرا ، ہندوستانی اکیڈمی ، الہ آباد ، ۱۹۴۳ء -

۲۰ - سکسینہ : تاریخ ادب اردو ، ترجمہ ، مرزا محمد عسکری ، نول کشور -

۲۱ - ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی : دلی کا دبستان شاعری ، انجمن ترقیٔ اردو ، دہلی ، ۱۹۴۰ء -

۲۲ - ثناء الحق : میر اور سودا کا عہد ، ادارۂ تحقیق و تصنیف ، کراچی ، ۱۹۶۵ء -

۲۳ - ڈاکٹر عبداللہ : نقد میر ، آئینہ ادب ، لاہور ، ۱۹۵۸ء -

۲۴ - پروفیسر مجنوں گورکھپوری : نقوش و افکار ، (میر اور ہم) ادارۂ فروغ اردو ، لکھنئو -

۲۵ - پروفیسر آل احمد سرور : میر کے مطالعے کی اہمیت ، علی گڑھ میگزین ، شمارہ ۲ ، ۱۹۵۷ء -

۲۶ - ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی : میر—حیات اور شاعری ، دہلی ، ۱۹۵۱ء -

۲۷ - محمد حسن عسکری : میر جی ، رسالہ ساقی میر نمبر کراچی ، ۱۹۴۷ء -

۲۸ - پروفیسر کلیم الدین احمد : اردو شاعری پر ایک نظر ، پٹنہ ، ۱۹۴۴ء -

۲۹ - نیاز فتح پوری : انتقادیات ، نگار لکھنؤ ، ۱۹۴۴ء -

۳۰ - مرزا جعفر علی خاں اثر : مقدمہ مزامیر ، کتابی دنیا ، دہلی ، ۱۹۴۷ء -

۳۱ - پروفیسر امرناتھ جھا : مقالہ میر تقی میر ، الہ آباد ، ۱۱۴۷ء -

۳۲ - آہ سیتا پوری : فلسفۂ کلام میر ، سیتا پور ، ۱۹۳۶ء -

۳۳ - ناصر کاظمی : میر تقی میر ، سویرا ، ۱۹ ، ۲۰ ، ۲۱ ، لاہور -

۳۴ - ڈاکٹر ابواللیث صدیقی : میر کی فارسی شاعری، رسالہ ، مصنف علی گڑھ نمبر ۵ ، ۱۹۴۳ء -

۳۵ - مدیر نیرنگ رام پور : میر کا فارسی کلام ، رسالہ نیرنگ ، میر نمبر ، ۱۹۲۸ء -

۳۶ - ڈاکٹر محمد حسن : دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی اور فکری پس منظر ، علی گڑھ ، ۱۹۶۰ -

۳۷ - Dr. Graham Bailey : Urdu Litrature, Calcutta, 1936

۳۸ - Ralph Russell and Khurshidul Islam : Three Mughal Poets, Harvard, 1968

۳۹ - Dr. Mohammad Sadiq : History of Urdu Literature, Oxford, 1964

اشاریہ